BEDD101EPT

مطالعہ متون اور ان پر اظہار خیال

Reading and Reflection on Texts (EPC - I)

برائے

بیچلر آف ایجوکیشن

(سال اول)

ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

© مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

سلسلہ مطبوعات نمبر-3

ISBN: 978-93-80322-09-4

Edition: June, 2018

ناشر	:	رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد
اشاعت	:	جولائی 2018
تعداد	:	1200
قیمت	:	145 روپے (فاصلاتی طرز کے طلبہ کی داخلہ فیس میں کتاب کی قیمت شامل ہے۔)
مطبع	:	میسرز پرنٹ ٹائم اینڈ بزنس انٹر پرائزز، حیدرآباد

Reading and Reflecting on Texts (EPC-1)

Written & Edited by:

Dr. Najmus Sahar

Associate Professor, Department of Education & Training

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

In collaboration with:

Directorate of Translation and Publications

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS)

E-mail: directordtp@manuu.edu.in

فاصلاتی تعلیم کے طلبا و طالبات مزید معلومات کے لیے مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ قائم کر سکتے ہیں:

ڈائرکٹر

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

گچی باؤلی، حیدرآباد-500032

Phone No.: 1800-425-2958, website: www.manuu.ac.in

فہرست

اکائی نمبر	مضمون	مصنف	صفحہ نمبر
	پیغام	وائس چانسلر	5
	پیش لفظ	ڈائرکٹر	6
	کورس کا تعارف	ایڈیٹر	7
اکائی 1:	بیانیہ اور وضاحتی واقعات کے تئیں مشغول رکھنا	ڈاکٹر نجم السحر اسوسی ایٹ پروفیسر ڈی ڈی ای، مانو، حیدرآباد	9
اکائی 2:	معروف مضامین پر مبنی وضاحتی تحریروں کے ساتھ مشغول رکھنا	ڈاکٹر نجم السحر	21
اکائی 3:	صحافتی تحریروں کے ساتھ مشغول رکھنا	ڈاکٹر نجم السحر	31

ایڈیٹر:
ڈاکٹر نجم السحر
اسوسی ایٹ پروفیسر ڈی ڈی ای، مانو، حیدرآباد
کوآرڈنیٹر بی۔ایڈ (فاصلاتی) پروگرام

لینگویج ایڈیٹر:
ڈاکٹر نجم السحر
اسوسی ایٹ پروفیسر ڈی ڈی ای، مانو، حیدرآباد
کوآرڈنیٹر بی۔ایڈ (فاصلاتی) پروگرام

پیغام
وائس چانسلر

وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے جس ایکٹ کے تحت مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ہے اُس کی بنیادی سفارش اُردو کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کا فروغ ہے۔ یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جو ایک طرف اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد بناتا ہے تو دوسری طرف ایک امتیازی وصف ہے، ایک شرف ہے جو ملک کے کسی دوسرے اِدارے کو حاصل نہیں ہے۔ اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد ومنشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ بھی تصدیق کردیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت رسائل واخبارات کی اکثریت میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہماری یہ تحریریں قاری کو کبھی عشق ومحبت کی پُر پیچ راہوں کی سیر کراتی ہیں تو کبھی جذباتیت سے پُر سیاسی مسائل میں اُلجھاتی ہیں، کبھی مسلکی اور فکری پس منظر میں مذاہب کی توضیح کرتی ہیں تو کبھی شکوہ شکایت سے ذہن کو گراں بار کرتی ہیں۔ تاہم اُردو قاری اور اُردو سماج آج کے دور کے اہم ترین علمی موضوعات چاہے وہ خود اُس کی صحت وبقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، وہ جن مشینوں اور آلات کے درمیان زندگی گزارر ہا ہے اُن کی بابت ہوں یا اُس کے گردوپیش اور ماحول کے مسائل..... وہ ان سے نابلد ہے۔ عوامی سطح پر اِن اصناف کی عدم دستیابی نے علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کردی ہے جس کا مظہر اُردو طبقے میں علمی لیاقت کی کمی ہے۔ یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبردآزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اسکولی سطح کی اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیرِ بحث آتے ہیں۔ چونکہ اُردو یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم ہی اُردو ہے اور اس میں علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔ اِسی مقصد کے تحت ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کا قیام عمل میں آیا ہے اور احقر کو اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ اپنے قیام کے محض ایک سال کے اندر ہی یہ برگِ نو، ثمر آور ہوگیا ہے۔ اس کے ذمہ داران کی انتھک محنت اور قلم کاروں کے بھرپور تعاون کے نتیجے میں کتب کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کم سے کم وقت میں نصابی اور ہم نصابی کتب کی اشاعت کے بعد اِس کے ذمہ داران، اُردو عوام کے واسطے بھی علمی مواد، آسان زبان میں تحریر عام فہم کتابوں اور رسائل کی شکل میں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کریں گے تاکہ ہم اِس یونیورسٹی کے وجود اور اِس میں اپنی موجودگی کا حق ادا کرسکیں۔

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز

خادمِ اوّل

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

پیش لفظ

ہندوستان میں اُردو ذریعہ تعلیم کی خاطر خواہ ترقی نہ ہو پانے کے اسباب میں ایک اہم سبب اُردو میں نصابی کتابوں کی کمی ہے۔اس کے متعدد دیگر عوامل بھی ہیں لیکن اُردو طلبہ کو نصابی اور معاون کتب نہ ملنے کی شکایت ہمیشہ رہی ہے۔ 1998ء میں جب مرکزی حکومت کی طرف سے مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو اعلیٰ سطح پر کتابوں کی کمی کا احساس شدید ہو گیا۔اعلیٰ تعلیمی سطح پر صرف نصابی کتابوں کی نہیں بلکہ حوالہ جاتی اور مختلف مضامین کی بنیادی نوعیت کی کتابوں کی ضرورت بھی محسوس کی گئی۔ فاصلاتی طریقہ تعلیم کے تحت چونکہ طلبہ کو نصابی مواد کی فراہمی ضروری ہے لہٰذا اُردو یونیورسٹی نے مختلف طریقوں سے اُردو میں مواد کا نظم کیا۔ کچھ مواد یہاں بھی تیار کیا گیا مگر علمی کتابوں کی منظم اور مستقل اشاعت کا سلسلہ شروع نہیں کیا جاسکا۔

موجودہ شیخ الجامعہ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے اپنی آمد کے ساتھ ہی اُردو کتابوں کی اشاعت کے تعلق سے انقلاب آفریں فیصلہ کرتے ہوئے ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کا قیام عمل میں لایا۔اس ڈائرکٹوریٹ میں بڑے پیمانے پر نصابی اور دیگر علمی کتب کی تیاری کا کام جاری ہے۔کوشش یہ کی جارہی ہے کہ تمام کورسز کی کتابیں متعلقہ مضامین کے ماہرین سے راست طور پر اُردو میں ہی لکھوائی جائیں۔اہم اور معروف کتابوں کے تراجم کی جانب بھی پیش قدمی کی گئی ہے۔توقع ہے کہ مذکورہ ڈائرکٹوریٹ ملک میں اشاعتی سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز ثابت ہوگا اور یہاں سے کثیر تعداد میں اُردو کتابیں شائع ہوں گی۔نصابی اور علمی کتابوں کے ساتھ مختلف مضامین کی وضاحتی فرہنگ کی ضرورت بھی محسوس کی جاتی رہی ہے۔لہٰذا یونیورسٹی نے فیصلہ کیا کہ اولاً سائنسی مضامین کی فرہنگیں اس طرح تیار کی جائیں جن کی مدد سے طلبہ اور اساتذہ مضمون کی باریکیوں کو خود اپنی زبان میں سمجھ سکیں۔ ڈائرکٹوریٹ کی پہلی اشاعت وضاحتی فرہنگ (حیوانیات و حشریات) کا اجرا فروری 2018ء میں عمل میں آیا۔

زیر نظر کتاب بی ایڈ کے طلبہ کے لیے تیار کی گئی ہے اور سال اول کی 17 کتابیں بیک وقت شائع کی جارہی ہیں۔ یہ کتابیں بنیادی طور پر فاصلاتی طریقہ تعلیم کے طلبہ کے لیے ہیں تاہم اس سے روایتی طریقہ تعلیم کے طلبہ بھی استفادہ کرسکیں گے۔اس کے علاوہ یہ کتابیں تعلیم و تدریس کے عام طلبۂ اساتذہ اور شائقین کے لیے بھی دستیاب ہیں۔

یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ زیر نظر کتاب کی تیاری میں شیخ الجامعہ کی راست سرپرستی اور نگرانی شامل ہے۔اُن کی خصوصی دلچسپی کے بغیر اس کتاب کی اشاعت ممکن نہ تھی۔نظامت فاصلاتی تعلیم اور اسکول برائے تعلیم و تربیت کے اساتذہ اور عہدیداران کا بھی عملی تعاون شاملِ حال رہا ہے جس کے لیے اُن کا شکریہ بھی واجب ہے۔

اُمید ہے کہ قارئین اور ماہرین اپنے مشوروں سے نوازیں گے۔

پروفیسر محمد ظفرالدین
ڈائرکٹر' ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز

کورس کا تعارف

مخلوقات قدرت میں انسان حیوان ناطق کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسے اس بات کی فضیلت حاصل ہے کہ وہ زبان کا استعمال کرتا ہے۔ اس کے معاملات زندگی زبان سے جڑے ہیں۔ اپنی تمام تر ضروریات کی تکمیل نیز اپنے جذبات وخیالات کی ترسیل دونوں ہی سے زبان کے سہارے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر انعام اللہ خاں شروانی لکھتے ہیں کہ ''زبان صرف انسان کے خیالات کے اظہار کا اہم اور مرکزی ذریعہ ہی نہیں بلکہ ایک نسل سے دوسری نسل تک تہذیب کی ترسیل کے لیے بھی لازم اور ضروری ہے''۔ یہ بھی ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ شخصیت کی ترقی زبان کے بغیر ممکن نہیں۔

یوں تو زبان کی مہارتوں کو حاصل کرنے کی ضرورت ہر انسان کو ہے لیکن اساتذہ کے لیے یہ اہمیت وضرورت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ کورس ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کورس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مختلف متون کو زیر تربیت اساتذہ کے مطالعہ کے لیے پیش کیا گیا ہے اور مطالعہ کے بعد ان سے یہ توقعات وابستہ کی جا رہی ہیں کہ وہ مختلف عملی سرگرمیوں کے ذریعے غور وفکر، بحث ومباحثہ، اظہار رائے، تحریر، تنقیدی خلاصہ نویسی وغیرہ جیسی صلاحیتوں کو فروغ دیں۔ اس کورس کے مقاصد میں طلباء میں مطالعہ کی عادت کو فروغ دینا بھی شامل ہے۔ یہ کورس زیر تربیت اساتذہ کو یہ مواقع فراہم کرتا ہے کہ وہ مختلف متون کو پڑھیں، ان پر غور کریں، مفاہیم کو سمجھیں اور ان پر تنقید وتبصرہ کے ذریعے اپنے تخلیقی اظہار اور جمالیاتی ذوق کی نشوونما کریں۔

زیر بحث کورس جملہ تین اکائیوں پر مشتمل ہے۔

پہلی اکائی: زیر تربیت اساتذہ کو بیانیہ اور واقعاتی متون کا مطالعہ کرنے اور ان پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے مقصد سے رکھی گئی ہے۔ دوسری اکائی میں معروف مضامین پر مبنی متون دیئے گئے ہیں اور تیسری اور آخری اکائی میں صحافتی ادب سے اخذ کردہ مضامین پیش کئے جا رہے ہیں۔

مطالعہ متون اور ان پر اظہار خیال

اکائی (1) بیانیہ اور وضاحتی واقعات کے تئیں مشغول رکھنا
Engaging with narrative and Descriptive Accounts

ساخت

1.1 تمہید
1.2 مقاصد
1.3 متن (1) ذوق چائے نوشی
1.4 متن (2) مولانا وحید الدین سلیم
1.5 متن (3) مردہ بہ دست زندہ
1.6 متن (4) A Service of Love
1.7 متن (5) Dancing in the Rain
1.8 اکائی کے اختتام کی مشقیں
1.9 حوالہ جات (Referances)

1.1 تعارف

جیسا کہ کورس کے تعارف میں بتایا جا چکا ہے، اس اکائی میں پانچ مختلف متون پیش کئے جا رہے ہیں جو بیانیہ اور وضاحتی نوعیت کے ہیں۔ ان میں انگریزی سے دو متون لئے گئے ہیں جو نویں تا بارھویں جماعتوں کے نصابی کتب سے منتخب کئے گئے ہیں۔ اور بقیہ تین متون اردو زبان کی نصابی کتب برائے گیارھویں، بارھویں اور ڈگری سطح سے منتخب کئے گئے ہیں۔ آپ ان کا غور سے مطالعہ کیجئے۔ مطالعہ کے دوران ان متون کی لسانی خصوصیات، اسلوبیاتی اور جمالیاتی پہلوؤں پر بھی توجہ مرکوز کیجئے۔ مطالعہ کے بعد آپ ان متون کے آخر میں دی گئی مختلف سرگرمیوں پر عمل کریں۔

1.2 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

- ☆ کسی بھی بیانیہ اور وضاحتی متن کے مفہوم کو سمجھ سکیں۔
- ☆ کسی بھی متن کی تلخیص کر سکیں
- ☆ کسی بھی بیانیہ متن کو مکالمہ میں تبدیل کر سکیں

☆ اپنی زندگی کے واقعات کو دوسروں کے آگے بیان کرسکیں

☆ کسی بھی واقعہ کو سن کر یا پڑھ کر اپنے الفاظ میں بیان کرسکیں

1.3 متن(1) ذوق چائے نوشی

ذیل میں دیا گیا متن مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف ''غبار خاطر'' سے لیا گیا ہے۔ ''غبار خاطر'' مولانا کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے احمد نگر جیل میں قید کے دوران اپنے دوست حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو لکھے یہ خطوط ''انشا پردازی'' کے بہترین نمونے ہیں اور انہیں ادب کے شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ چنانچہ ''غبار خاطر'' سے منتخب ایک خط کا متن ''ذوق چائے نوشی'' کے زیر عنوان پیش کیا جا رہا ہے۔

ذوق چائے نوشی

'' آپ کو معلوم ہے میں ہمیشہ صبح تین سے چار بجے کے اندر اٹھتا ہوں اور چائے کے پیہم فنجانوں سے جامِ صبوحی کا کام لیا کرتا ہوں۔

یہ وقت ہمیشہ میرے اوقاتِ زندگی کا سب سے زیادہ پُر کیف وقت ہوتا ہے لیکن قید خانے کی زندگی میں تو اس امر کی سرمستیاں اور خوفراموشیاں ایک دوسرا ہی عالم پیدا کر دیتی ہیں۔ یہاں کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا جو اس وقت خواب آلود آنکھیں لیے ہوئے اُٹھے اور قرینہ سے چائے بنا کر میرے سامنے دھرے۔ اس لیے خود اپنے دستِ شوق کی سرگرمیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس وقت بادۂ کہن کے شیشہ کی جگہ چینی چائے کا تازہ ڈبہ کھولتا ہوں اور ایک ماہرِ فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چائے دم دیتا ہوں، پھر جام وصراحی کو میز پر داہنی طرف جگہ دوں گا کے اس کی اولیت اسی کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ دسامان کار میں ان کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا اور کچھ نہ پوچھئے کے بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں؟ کسی بادہ گُسار نے شامپین اور بورڈ کے صد سالہ تہہ خانوں کے عرق کہن سال میں بھی وہ کیف وسرور کہاں پایا ہوگا جو چائے کہ اس دورِ صبح گاہی کا ہر گھونٹ میرے لیے مہیا کر دیتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ مَیں چائے کے لیے روسی فنجان کام میں لاتا ہوں۔ یہ چائے کی معمولی پیالیوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر بے ذوقی کے ساتھ پیجئے تو دو گھونٹ میں ختم ہو جائیں مگر خدانخواستہ میں ایسی بے ذوقی کا مرتکب کیوں ہونے لگا؟ میں جرعہ کشانِ کہن مشق کی طرح ٹھہر ٹھہر کر پیوں گا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لونگا پھر جب پہلا فنجان ختم ہو جائے گا تو کچھ دیر کے لیے رک جاؤں گا اور اس درمیانی وقفہ کو امتدادِ کیف کے لیے جتنا طول دے سکتا ہوں طول دونگا، پھر دوسرے اور تیسرے کے لیے ہاتھ بڑھاؤں گا اور دنیا کو اور اس کے سارے کارخانہ سود وزیاں کو یک قلم فراموش کر دوں گا۔

اس وقت بھی کہ یہ سطریں بے اختیار نوکِ قلم سے نکل رہی ہیں، اُسی عالم میں ہوں اور نہیں جانتا کہ ۹ اگست کی صبح کے بعد سے دنیا کا کیا حال ہُوا اور اب کیا ہو رہا ہے۔

میرا دوسرا پُر کیف وقت دوپہر کا ہوتا ہے بازیادہ صحتِ تعیّن کے ساتھ کہوں کہ زوال کا ہوتا ہے۔ لکھتے لکھتے تھک جاتا ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتا ہوں، پھر اٹھتا ہوں، غسل کرتا ہوں، چائے کا دور تازہ کرتا ہوں اور تازہ دم ہو کر پھر اپنی مشغولتیوں میں گُم ہو جاتا ہوں۔ اُس وقت آسمان کی بے داغ نیلگونی اور سُورج کی بے نقاب درخشندگی کا جی بھر کے نظارہ کروں گا اور اوراقِ دل کا ایک ایک دریچہ گھول دوں گا۔ گوشہ ہائے خاطر افسردگیوں اور گرفتگیوں سے کتنے ہی غبار آلود ہوں لیکن آسمان کی کشادہ پیشانی اور سورج کی چمکتی ہوئی خندہ روئی دیکھ کر ممکن نہیں کہ اچانک روشن نہ ہو جائیں۔ لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لیے کام میں لائیں، لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہوئی یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہُوا کہ مر جائے اور اس سے زتادہ مشکل کام کوئی نہ ہُوا کہ زندہ رہئے۔ جس نے یہ مشکل حل کر لی اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا۔

غالباً قدیم چینیوں نے زندگی کے مسئلہ کو دوسری قوموں سے بہتر سمجھا تھا۔ ایک پُرانے چینی مقولہ میں سوال کیا گیا ہے'' سب سے زیادہ دانش مند

آدمی کون ہے'' پھر جواب دیا ہے ''جو سب سے زیادہ خوش رہتا ہے'' اس سے ہم چینی فلسفہ زندگی کا زاویہ نگاہ معلوم کر لے سکتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ بالکل سچ ہے۔

اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے تو یقین کیجئے زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا۔ اب اس کے بعد اس سوال کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ آپ نے اور کیا کیا سیکھا؟ خود بھی خوش رہئے اور دوسروں سے بھی کہیے کہ خوش رہئے کہ اپنے چہروں کو غمگین نہ بنائیں۔ زمانہ حال کے ایک فرانسیسی اہل قلم آندری ژید (Andri Gide) کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی جو اس نے اپنی خود نوشتہ سوانح میں لکھی ہے ''خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے یعنی ہماری انفرادی زندگی کی نوعیت کا اثر صرف ہم ہی تک محدود نہیں رہتا وہ دوسروں تک بھی متعدی ہوتا ہے یا یوں کہئے کہ ہماری ہر حالت کی چھوت دوسروں کو بھی لگتی ہے اس لیے ہمارا اخلاقی فرض ہُوا کہ خود افسردہ خاطر ہو کر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں''۔

ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بیک وقت سینکڑوں آئینوں میں پڑنے لگتا ہے اگر ایک چہرے پر بھی غبار آ جائے گا تو سینکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے وہ پورے مجموعہ کا حادثہ ہے۔ دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اٹھتی ہے لیکن اسی ایک لہر سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں ہوئی۔ ہم جو کچھ اپنے لئے کرتے ہیں اس میں بھی دوسروں کا حصہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکے گی' اگر ہمارے چاروں طرف غمناک چہرے اکھٹے ہو جائیں گے۔ ہم خود خوش رہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خود خوش ہونے لگتے ہیں۔

سرگرمیاں:

ذیل میں دئے گئے سوالات کے جوابات زبانی اور تحریری دونوں طور پر دیجئے۔

(1) اوپر دیئے گئے متن میں صبح کی معمولات کو مصنف نے کس طرح پیش کیا ہے۔

(2) درج ذیل الفاظ کی وضاحت کیجئے

(الف) بادہ کہن

(ب) گوشہ ہائے خاطر

(ج) دست شوق

(د) سرمستیاں اور خود فراموشیاں

(3) مصنف نے اپنے آپ کو خوش رکھنے کا کون سا طریقہ اختیار کیا۔

(4) ''ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے''۔ اس جملہ کی مصنف کس طرح وضاحت کرتا ہے؟

(5) مصنف کے نزدیک زندگی کا سب سے بڑا کام کون سا ہے۔

1.4 متن (2) مولانا وحید الدین سلیم

درج ذیل اقتباس بابائے اردو مولوی عبدالحق کا لکھا ہوا خاکہ ہے جو ان کی مرتب کردہ کتاب ''چند ہم عصر'' سے لیا گیا ہے۔ اس خاکہ کو بغور پڑھئے اور پھر آخر میں دی گئی سرگرمیوں پر عمل کیجئے۔

مولانا وحید الدین سلیم

مولانا سلیم کے انتقال سے اردو ادب کی صنف میں ایک جگہ خالی ہوگئی ہے جس کا پر کرنا آسان نہیں۔ جامعہ عثمانیہ ہی کو ان کا جانشین ملنا مشکل نہیں

بلکہ اب ان جیسا ادیب سارے ملک میں نظر نہیں آتا۔ وہ ایک جامع حیثیات شخص تھے۔ عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ اردو زبان پر ان کی وسیع نظر تھی، خاص کر نئے الفاظ بنانے میں انہیں بڑا ملکہ تھا، ان کی کتاب ''وضع اصطلاحاتِ علمیہ'' ایک حد تک ان کی وسعت نظری اور تبحر کی شاہد ہے۔ وہ اعلیٰ درجہ کے نثار تھے اور شعر بھی خوب کہتے تھے۔ شاعری ان کی زورِ طبیعت کا نتیجہ تھی، بعینہ جیسی مولوی نذیر احمد مرحوم کی شاعری، لیکن ''سلیم'' مرحوم ان سے سبقت لے گئے تھے۔ ان کے قلم اور آواز میں بڑا زور تھا۔ ان کے چہرے سے ان کی طباعی اور ذہانت معلوم ہوتی تھی۔ یہ سب باتیں مولوی نذیر احمد سے ملتی جلتی تھیں۔

مرحوم نے عمر بھر یا تو طالب علمی کی یا علم و ادب کی خدمت کی۔ علاوہ ایک بلند پایہ ادیب ہونے کے وہ اعلیٰ درجہ کے اخبار نویس بھی تھے۔ ''مسلم گزٹ'' کے پرچے جن صاحبوں نے غور سے پڑھے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ ایسے زبردست مضامین، معاملات وقت پر کسی دوسرے اخبار میں نہیں نکلے ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کو جب انہوں نے اپنے ہاتھ میں لیا تو اس کی کایا پلٹ دی، یا تو وہ ایک مردہ اخبار تھا، دفعتاً زندہ ہوگیا۔ ان کا رسالہ ''معارف'' اردو کے ان چند رسالوں میں ہے جنہوں نے ملک میں علمی ذوق پیدا کر کے زبان کی حقیقی خدمت کی ہے۔ وہ کسی رنگ میں ہوں، تھے وہ ادیب ہی، سیاسیات کا انہیں کوئی ذوق نہ تھا، البتہ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔

مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف الطبع تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات ظرافت میں حد سے تجاوز کر جاتے تھے، مگر بڑے سادہ طبیعت کے آدمی تھے۔ مصلحت، سلیقے اور صفائی کا داغ ان کے دامن پر نہ تھا، جو جی میں آتا کہہ بیٹھتے تھے اور جو چاہتے کر گزرتے تھے۔ جہاں کسی نے غلطی کی فوراً ٹوک دیتے تھے، کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کا محل و موقع بھی ہے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ان کی طبیعت سے واقف نہ تھے، ان کی باتوں سے اکثر ناراض ہو جاتے تھے۔ جس طرح باوجود زبردست اخبار نویس ہونے کے سیاسیات کا ذوق نہ تھا، اسی طرح باوجود زبردست عالم و فاضل ہونے کے مذہب سے بیگانہ تھے۔ یہ ذوقی چیز ہے اسے علم و فضل سے کوئی واسطہ نہیں۔

جس طرح انہیں طالب علمی میں مولانا فیض الحسن جیسے بے مثل ادیب، استاد ملے اسی طرح اس کے بعد سرسید اور مولانا حالی جیسے عالی خیال پیشوا بھی نصیب ہوئے۔ ان بزرگوں نے ان کے خیالات اور ادب پر بہت اثر ڈالا۔ مگر وہ عمر بھر طالب علم ہی رہے، مصلحت وقت اور زمانہ شناسی ان کے نصیب میں نہ تھی اور جو کبھی بدنصیبی سے انہوں نے اس کوچے میں قدم رکھا تو پہلے ہی قدم میں لغزش کھائی۔ اس چیز کے لیے کچھ تو فطری مناسبت ہونی چاہیے اور کچھ صحبت اور تجربہ، ان میں سے ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔

ان کے دوست بہت ہی کم تھے۔ شاید دو چار ہی ہوں گے، مگر جن کے دوست تھے دل سے تھے لیکن ساتھ ہی بہت مرنج و مرنجان تھے، کسی کو حتی المقدور ناراض نہیں ہونے دیتے تھے۔ خود خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھنا چاہتے تھے۔ بہت بے تکلف تھے اور خوب باتیں کرتے تھے اور خوب ہنستے اور ہنساتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ جامعہ عثمانیہ کو مولانا سے بہتر پروفیسر نہیں مل سکتا تھا۔ شاید قدرت کو یہ منظور تھا کہ جس یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اردو ہے وہاں اردو کا پروفیسر بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تھا جو اس کی شان اور ضرورت کے مناسب ہو۔ انہوں نے اس جامعہ کے طلبا میں جو علمی اور ادبی ذوق پیدا کیا ہے وہ انہیں کا کام تھا اور یہ بہت بڑا احسان ہے۔ تعلیم کا اصل منشا ذوق پیدا کرنا ہے اور پھر وہ اپنا راستہ خود نکال لیتا ہے۔

مرحوم کی طالب علمی کا زمانہ بہت عسرت میں گزرا اور آخری زمانہ جو فارغ البالی کا تھا وہ بھی افسوس ہے کہ عسرت ہی میں بسر ہوا۔ انہیں اپنی فارغ البالی سے کچھ لینا نہ تھا۔ گویا ان کی عمر زیادہ نہ تھی شاید اڑسٹھ کے لگ بھگ، لیکن ان کے قویٰ ایسے اچھے تھے کہ بہت دنوں اور جی سکتے تھے لیکن انہوں نے کبھی صحت و صفائی کا خیال نہ رکھا اور نہ کبھی اپنے کھانے پینے کا کوئی معقول انتظام کیا۔ وہ ان چیزوں کو جانتے ہی نہ تھے، یہی ان کی بیماری اور بالآخر ان کی موت کا باعث ہوا۔

انجمن ترقی اردو اور خاص کر رسالہ ''اردو'' سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ ان کے بعض بہترین مضامین ''اردو'' میں شائع ہوئے ہیں۔ مولانا شرر مرحوم کے

انتقال پر جب انجمن نے مرحوم کے نام سے ''اردو'' کے بہترین مضامین کے لیے مستقل طور پر سالانہ تین انعامات کی تجویز کی تو سب سے پہلا انعام جو دوسو روپیہ کا تھا مولانا نے خود ہر سال دینا منظور فرمایا۔ وہ صرف ایک سال دینے پائے تھے کہ دوسرے سال خود اس دنیا سے منھ موڑ کر چلے گئے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ میرے مہربان اور شفیق دوست تھے اور مجھے ان کی موت کا بے حد رنج ہے۔ میں ان کی موت کو قومی حادثہ سمجھتا ہوں۔ ان کے ہونے سے ہمیں بڑا سہارا تھا۔ ہر علمی اور ادبی کام میں ہم ان کا نام سب سے پہلے شریک کرتے تھے۔ اب جو وہ نہیں ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوت کم ہوگئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا جیسی طبیعت، اور ذہانت اور جدت کے بہت کم لوگ ہوتے ہیں، ان کی تحریر میں بڑی قوت تھی اور حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا، بات کی تہہ کو خوب پہنچتے تھے اور زبان کے تو استاد تھے۔ جدید تعلیم نہیں پائی تھی، مگر مغربی تعلیم کا جو منشا ہے، اس سے ایسے واقف تھے کہ جب کم جدید تعلیم یافتہ واقف ہوں گے۔ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ مگر جب انگریزی سے اردو میں اصطلاحات یا الفاظ ترجمہ کرنے کی ضرورت پڑتی تھی تو انگریزی داں بھی ان کی واقفیت کو دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے، وہ الفاظ کے کینڈوں اور ان کی فطرت کو خوب سمجھتے تھے اور لفظوں کی تلاش یا نئے لفظوں کے بنانے میں کمال رکھتے تھے اور لفظ ایسے موزوں اور جلد بناتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دماغ میں سانچے بنے بنائے رکھے ہیں۔ جن میں سے الفاظ ڈھلتے چلے آ رہے ہیں۔

ہمیں ان کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنھوں نے مرحوم کی طرح اپنی ساری عمر علم و ادب کی خدمت میں وقف کر دی ہو۔ اس راہ میں مخدوم بننا آسان ہے مگر خادم بننا بہت دشوار ہے۔

انہوں نے محض اپنی محنت اور قابلیت سے یہ درجہ پایا۔ ایک غریب لڑکا جس کے پاس پڑھنے کو کتابیں اور پھر پیٹ کھانے کو روٹی نہ تھی، وہ اپنی ہمت اور شوق اپنے علم و فضل کے زور سے ایسا ہوا کہ آج اس کی موت پر ایک بڑے طبقے کو حقیقی رنج اور افسوس ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو علم و ادب کا ایک ستون گر گیا۔ ان کی زندگی صاف بتاتی ہے کہ شوق اور محنت عجیب چیزیں ہیں جسے ہم کمال کہتے ہیں وہ انہیں دونوں کا خانہ زاد ہے۔

سرگرمیاں:

(1) مولانا وحید الدین سلیم کی ظرافت کو مصنف نے کس طرح پیش کیا ہے۔

(2) اس متن کی تلخیص اپنے الفاظ میں کیجئے۔

(3) مولانا وحید الدین سلیم کی علمی کارناموں کا بیان اس خاکہ کے حوالہ سے کیجئے۔

(4) اردو کی اصطلاحات سازی میں وحید الدین سلیم کی کیا خدمات ہیں

(5) اس خاکہ میں مولانا کی کن فطری خامیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

1.5 متن نمبر (03) مردہ بہ دست زندہ

اردو طنز و ظرافت کی نثر میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ ان کا ایک مضمون ''مردہ بہ دست زندہ'' سے ذیل میں اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔ اسے پڑھیے اور پڑھتے وقت اس میں پائے جانے والے طنز و ظرافت پر غور کیجئے۔

مردہ بہ دست زندہ

زمانہ نے خلوص دلوں سے مٹا دیا ہے۔ سچی محبت کی جگہ ظاہر داری نے لے لی ہے۔ نہ اب جینے میں کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ جاتا ہے۔ غرض دنیا داری ہی دنیا داری رہ گئی ہے۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا گویا اپنا عزیز مر گیا ہے۔ اب کوئی اپنا بھی مر جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مر گیا۔ جنازہ کے ساتھ جانا اب سب رسماً رہ گیا ہے۔ صرف اس لیے چلتے جاتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ واہ جیتے جی تو دوستی و محبت کا یہ دم بھرا جاتا تھا، مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ دیکھا کہ کون مر گیا۔ اب رہی دل کی حالت تو اس کا بس خدا ہی مالک ہے۔ آیئے میرے ساتھ آیئے

کل کی میتوں کا رنگ بھی دکھادوں۔

یہ لیجئے۔سامنے ہی کے مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔کوئی بڑے شخص ہیں سینکڑوں آدمی جمع ہیں۔موٹریں بھی ہیں۔گاڑیاں بھی ہیں۔ غریب بھی ہیں۔امیر بھی ہیں۔ بچارے غریب تو اندر جابیٹھے ہیں۔کچھ پڑھ بھی رہے ہیں۔ جتنے امیر ہیں وہ یا تو اپنی اپنی سواریوں میں بیٹھے ہیں یا دروازہ پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔ جو غریب آتا ہے وہ سلام کرتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔ جو امیر آتا ہے وہ ان باہر والوں ہی میں مل کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پہلا سوال یہی ہوتا ہے یہ ''کیا مر گئے؟ بھی ہمارے تو بڑے دوست تھے''۔اتنا کہا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیا نکالی۔ لیجئے تعزیت ختم ہوئی اور رنج دلی کا اظہار ہو چکا۔اب دنیا بھر کے قصے چھڑے ایک دوسرے سے نہ ملنے کی شکایت ہوئی۔دفتر کی کارروائیاں درفت کی گئیں۔ملک کی خبروں پر رائے زنی ہوئی۔ غرض اس بات چیت کا یہاں تک سلسلہ کھینچا کہ مکان سے جنازہ نکل آیا۔یہ دیکھتے ہی دروازہ کی بھیڑ چھٹ گئی۔کچھ ادھر ہو گئے کچھ اُدھر۔آگے آگے جنازہ ہے، اس کے پیچھے پیچھے یہ سب لوگ ہیں۔ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ ان ساتھ والوں میں تقسیم ہونی شروع ہوئی۔اور چپ چاپ اس طرح ہوئی کہ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہوئی اور کیوں کر ہوئی۔جن کو پیچھے رہنا تھا انہوں نے چال آہستہ کر دی جنہیں ساتھ جانا تھا وہ ذرا تیز چلے۔غرض ہوتے ہوتے یہ ساتھ والے تین حصوں میں بٹ گئے۔آگے تو وہ رہے جو مرنے والے کے عزیز تھے یا جن کو جنازہ اٹھانے کے لیے اُجرت پر بلایا گیا تھا۔اس کے پیچھے وہ لوگ رہے جن کے پاس یا تو سواریاں نہ تھیں یا ''شرما شرمی پیدل'' ہی جانا مناسب سمجھتے تھے۔آخر میں وہ طبقہ جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہٹتا تا اپنی سواریوں تک پہنچ گیا اور ان میں سوار ہو گیا۔اگر پیدل چلنے والوں میں کوئی عہدیدار ہیں تو غرض مندوں سے ان کو یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ایک آیا جھک کر سلام کیا گھر بھر کی مزاج پرسی کی۔ مرنے والے کے کچھ واقعات بیان کئے۔اگر ڈاکٹر کا علاج تھا تو ڈاکٹری کی برائیاں کیں۔اگر حکیم کا علاج مرا ہے تو طبابت کی خرابیاں ظاہر کیں۔اور اسی سلسلہ میں اپنے واقعات بھی بیان کر گئے۔ان سے پیچھا نہ چھٹا تھا کہ دوسرے صاحب آ گئے اور انہوں نے بھی وہی دنیا بھر کے قصے شروع کئے غرض اسی طرح جوڑی بدلتے بدلتے مسجد تک پہنچ ہی گئے۔یہاں ہمراہوں کی پھر تقسیم ہوتی ہے۔ایک تو وہ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اور اب بھی پڑھیں گے اور دوسرے وہ ہیں جو نہا دھو کر کپڑے بدل کر خاص اسی جنازہ کے لیے آئے ہیں۔تیسرے وہ ہیں جو اپنی وضعداری پر قائم ہیں۔یعنی نماز نہ کبھی پڑھی ہے اور نہ اب پڑھیں گے۔دور سے مسجد کو دیکھا اور انہوں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جنازہ مسجد تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ان کو کسی دیوار کسی موٹر یا کسی گاڑی کی آڑ مل گئی۔ یہ وہیں کھڑے ہو گئے اور سگریٹ پی کر یا پان کھا کر انہوں نے وقت گزار دیا۔ہاں اس بات کا انتظام رکھا کہ نماز ختم ہونے کی اطلاع فوراً مل جائے۔ادھر نماز ختم ہوئی ادھر یہ لوگ مسجد کے دروازہ کی طرف بڑھے۔ادھر جنازہ نکلا ادھر یہ پہنچے۔بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نماز پڑھ کر مسجد ہی سے نکل رہے ہیں۔ یہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا۔ اب راستہ والوں کو سنئے۔اگر میت کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا۔اگر جنازہ کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوئے تو دوکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آ رہے ہیں۔آئے، مرنے والے کا نام پوچھا۔مرض دریافت کیا اور واپس ہو گئے۔ گویا میونسپل کمیٹی نے رجسٹر رحیات وممات ان ہی کے تفویض کر دیا ہے اور یہ صرف اس لیے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر میں مرنے والے کا نام خارج کر دیں۔

سرگرمیاں

(1) اوپر کے دیئے گئے متن کو اپنے الفاظ میں بیان کیجئے۔

(2) اوپر دیئے گئے متن میں میت کی تعریف کا حال کس طرح پیش کیا گیا ہے؟

1.6 متن (4)

A Service of love

When one loves one's Art no service seems too hard.

Joe Larrabee came from the middle West with a genius for painting. As a child of six, he drew a picture of the town pump with an important citizen passing it in a hurry. This effort was framed and hung in the drug store window. At twenty he left for New York with a flowing necktie and small capital.

Delia Caruthers came from the South. She was so promising a singer that her relatives collected a small amount for her to go to New York and learn music.

Joe and Delia met in a studio where a number of art and music students had come together to discuss their art. Joe and Delia fell in love and in a short time were married - for, when one loves one's Art no service seems too hard.

Mr. and Mrs. Larrabee began to live in a flat. It was a lonely place. But they were happy - for they had their Art, and they had each other. And my advice to the rich young man would be : sell all you have, and give it to the poor - for the happiness of living in a flat with your Art and your Delia.

Joe was painting in the class of the great Magister - you know his fame as painter. His fees are high; his lessons are light. Delia was studying under Rosenstock - you know his fame as musician.

They ware mighty happy as long as their money lasted. Their aims were very clear. Joe would learn very soon to paint pictures that old gentlemen with side-whiskers and thick purses would fight with one another in his studio for buying. Delia was going to master the piano and fill concert halls all over the country with people who would pay twice as usual rates to hear her play.

But the best, in my opinion, was the home life in the little flat - the warm chats after the day's study; the pleasant dinners and fresh, light breakfasts; the exchange of hopes; the help and love they gave each other.

But after a while Art became weak. Everything going out and nothing coming in, as people say. There was no money to pay Mr. Magister and Mr. Rosenstock their fees. When one loves one's Art no service seems too hard. So, Delia said she must give music lessons to buy their food.

For two or three days she went out looking for pupils. One evening she came home in high spirits.

'Joe, dear, she said, happily, I have a pupil. And, oh, the loveliest pupil! General - General A. B. Pinkney's daughter on Seventy- first Street. Such a splendid house, Joe, you should see it. Oh, Joe, I never saw anything like it before.

"My pupil is his daughter Clementina. I dearly love her already. She's a delicate thing - dresses always in white; and the sweetest, simplest manners! Only eighteen years old. I have to give three lessons a week; and, just think, Joe! Five dollars a lesson. I don't mind it a bit; for when I get two or three more pupils I can continue my lessons with Mr.Rosenstock. Now, don't look so unhappy, dear, and let's have a nice supper."

"That's all right for you, Dele," said Joe, opening a tin of peas, " but how about me? Do you think I'm going to let you work for wages while I enjoy myself painting? No. I can sell papers or break

stones and bring in a dollar or two."

Delia came and hung about his neck.

"Joe, dear, you are silly. You must keep on at your studies. I hadn't left my music and gone to work at something else. While I teach I learn. I am always with my music. And we can live as happily as rajahs on fifteen dollars a week. You mustn't think of leaving Mr. Magister.'

'All right, said Joe, reaching for the vegetable dish. 'But I hate your giving lessons. It isn't Art. But you're a dear to do it.'

'When one loves one's Art, no service seems too hard, said Delia.

'Magister praised the sky in that drawing made in the park, said Joe. 'And Tinkle gave me permission to hang two of them in his window. I may sell one if the right kind of a rich art-collector sees them.'

'I am sure you will, said Delia, sweetly. 'And now let's be thankful for General Pinkney and this chicken roast.'

During all of the next week the Larrabees had an early breakfast. Joe was very much interested in some morning-effect sketches he was doing in Central Park, and Delia packed him off, breakfasted, hugged, praised, and kissed at 7 o'clock. Art is a charming mistress. It was most often 7 o'clock when he returned in the evening.

At the end of the week Delia, Sweetly proud but tired, threw three five-dollar bills on the 8x10 (feet) sitting room.

'Sometimes, she said, a little wearily, 'Clementina tries my patience. I' m afraid she doesn't practise enough, and I have to tell her the same thing so often. And then she always dresses entirely in white, and that does get boring. But Gen. Pinkney is the dearest old man!'

I wish you could know him, Joe. He comes in sometimes when I am with Clementina at the piano- he is a widower, you know - and stands there pulling his white beard. 'And how are the lessons getting on?' , he always asks.

'I wish you could see the drawing-room, Joe, and rugs! And Clementina has such a funny little cough. I hope she is stronger than she looks. Oh, I really am getting very fond of her, she is so gentle and noble. Gen. Pinkney's brother was once Minister to Bolivia.'

And then Joe, with pride, drew forth a ten, a five, a two and a one - all new dollar notes - and laid them beside Delia's earnings.

'Sold that water colour of the tower to a man from Peoria,' he announced joyfully.

'Don't joke with me,' said Delia, 'not from Peoria!'

'All the way. I wish you could see him, Dele. Fat man with a woollen muffler and a bald head. He saw the sketch in Tinkle's window and thought it was a windmill at first. He bought it anyhow. He ordered another - an oil sketch of the Lackawanna goods yard to take back with him. Music lessons! Oh, I guess Art is still in it.

'I' m so glad you've kept on,' said Delia, heartily. 'You're certain to succeed, dear. Thirty-three

dollars! We never had so much to spend before. We'll have oysters tonight.'

'And with champignons,' said Joe.

On the next Saturday evening Joe reached home first. He spread his eighteen dollars on the dining table and washed what seemed to be a great deal of dark paint from his hands.

Half an hour later Delia arrived, her right hand tied up in a shapeless bundle of wraps and bandages.

'What happened?' asked Joe after the usual greetings. Delia laughed, but not very joyously.

'Clementina,' she explained, 'said we must have a Welsh rabbit after her lesson. She is such a strange girl. Welsh rabbits at five in the afternoon! The General was there. You should have seen him run for thd dishes Joe, as if there wasn't a servant in the house. I know Clementina isn't in good health; she is so nervous. In serving the rabbit she spilled a great lot of it, boiling hot, over my hand and wrist. It hurt awfully, Joe. And the dear girl was so sorry! But Gen. Pinkney! - Joe, that old man nearly went mad. He rushed downstairs and sent somebody out to a drugstore for some oil and things to bind it up with. It doesn't hurt so much now."

" What's this?" asked Joe, taking the hand tenderly and pulling at some white threads beneath the bandages.

'It's something soft,'said Delia, "that had oil on it. Oh, Joe, did you sell another sketch?' She had seen the money on the table.

" Did I? Said Joe; 'just ask the man from Peoria. He got his goods yard today, and he isn't sure but he thinks he wants another view of the park and a view on the Hudson river, what time this afternoon did you burn your hand, dele?'

'Five o' clock, I think,'said Dele sadly. "The iron- I mean the rabbit came off the fire about that time. You ought to have seen Gen. Pinkney, Joe, when .....'

'Sit down here a moment, Dele,'said Joe. He drew her to the sofa, sat beside her and put his arm across her shoulders.

'What have you been doing for the last two weeks, Dele?' he asked.

She looked at his face for a moment or two with an eye full of love, and murmured a word or two about Gen. Pinkney; but at length down went her head and out came the truth and tears.

'I couldn't get any pupils,'she confessed. 'And I couldn'think of your giving up your lessons; and I got a place ironing shits in that big Twenty fourth Street Laundry. And I think I did very well toinvent both General Pinkney and Clementina, don't you, Joe? And when a girl in the laundry set down a hot iron on my hand this afternoon, I was inventing that story about the Welsh rabbit all the way home. You're not angry, are you, Joe? And if I hadn't got the work you mightn't have sold your paintings to that man from Peoria."

He wasn't from Peoria,' said Joe, slowly.

'Well, it doesn't matter where he was from. How clever you are, Joe- and- kiss me, Joe- and what made you ever suspect that I wasn't giving music lessons to Clementina?'

' I didn't,' said Joe, 'until tonight. I sent up this cotton waste and oil from the engine- room this afternoon for a girl upstairs who had her hand burned with an iron. I've been working the engine in that laundry for the last two weeks',

' And then you didn't .... "

' My buyer from Peoria,' said Joe, 'and Gen. Pinkney are both creations' of the same art - but you wouldn't call it either painting or music."

And then they both laughed, and Joe began:

' When one loves one's Art no service seems-'

But Delia stopped him with her hand on his lips. 'No,' she said - 'just "When one loves." (Slightly simplified version._)

Activities:

(1) Narrate the story in your own words.

(2) Describe the events that led to the marriage of Joe and Delia?

(3) Narrate any other story of your choice.

(4) What do you understand by the term "when One love one's Art, no service seems too hard.

1.7 متن(5)

Dancing in the Rain

1. One often hears of the high prevalence of child labour in our country. Of the many reports I have read, perhaps the most disturbing was a report on the condition of children employed by zari factories in Delhi, Mumbai and other parts of India. It grieves me to imagine children exposed to such inhumanity.

2. Robbing children of their childhood is a criminal act, and our society must weed this malaise out from the root. But where does the root lie? Before you attempt an answer, let me give you an anecdote from the other end of the social spectrum.

3. A colleague in Wipro has a child studying in standard nine of a reputed school in Bangalore. This child wakes up at 5 a.m. and studies for an hour before going to school. She returns from school at 4 p.m. and rushes for her IIT entrance exam coaching class. At 6 p.m., she has tuitions for 2 hours. Post dinner, she spends an hour or more on homework. I asked her when she gets time to play. She replied that she does not play. She gets half - hour of free time each day, which she spends watching her favourite serial on television. She also added that board exams and entrance exams are very important, and that you only get one chance.

4. Is the condition of this child different from that of the child in the zari factory?

5. When I look at children, I wonder whether they have time to play with friends, to meet interesting people, to explore the world, and to follow their curiosity. When the first monsoon showers begin, I would think that the streets would be full of children rushing headlong into the rain, dancing and playing. However, I think today, the rains fall on empty streets.

6. This, my friends, is the new Indian reality in our villages, in our slums, and in our metropolitan high-rises. Whatever the reasons - poverty, societal aspiration, apathetic individuals and organizations, or just the burden of circumstances - the reality is that our children are straitjacketed.

7. The final indicator of a country's independence is the way its children live. Are children free from the malaise of poverty and hunger? Are they free from the burden of parental aspiration? Are they free from norms of social conditioning? Are we enduring the curiosity of our children continues to burn and is not stamped out? Are they free to explore the world, to realize their unique potential, and thereby, help discover the true potential of the society itself?

8. Gandhiji said that the greatest lessons in life are learnt from children, not from learned men. A child will fearlessly try before giving up. As adults, fearing failure, we give up even before we try. A child is inherently curious about the world, about relationships, about wanting to understand how things work. As adults, our blinkered and conditioned self prevents us from truly exploring without prejudice. For a child, what she does is meaningful in its own right. As an adult, we usually link every action to an external reward of money or recognition.

9. I did not learn how to be a father from manuals. Whatever little I learnt about being a parent, I learnt by observing my children and letting them teach me. Similarly, I think our teachers could grow enormously by learning from their students.

10. We will then refrain from pushing our knowledge down their young minds, and begin the democratic process of being joint learners as we discover and understand our world. I believe a powerful force for empowerment is to have motivated teachers who are learners first, teachers second. Only then will we stop trying to mould children into our "adult" likeness. Only then will we let them blossom.

11. If India has to develop economically, socially, intellectually, and culturally, we must empower those most vulnerable to social diktat: our children. Let us resolve to give our children the freedom of childhood; let us change our schools from being textbook prisons to laboratories of exploration; let us change homes from being tuition centres to playgrounds of art and sport.

12. India will be radiant when our children are free to dance in the rain.

Activities:

(1) Express your opinion regarding child labour?

(2) Narrate the daily routine of any High School student you know.

(3) "Great Lessons in life are learnt from children, not from men".
Eloborate in your own words.

1.8 اکائی کے اختتام کی مشقیں:

(1) ہائی اسکول کی اردو کی کسی بھی درسی کتاب سے کوئی ایک متن منتخب کیجیے اور اسے اپنے الفاظ میں لکھیے۔

(2) گیارھویں اور بارھویں جماعت کی اردو زبان کی کوئی بھی درسی کتاب سے کوئی اکائی منتخب کیجیے اور اس پر اپنے خیال کا زبانی اور تحریری دونوں طرح سے اظہار کیجیے۔

(3) انگریزی زبان کی ہائی اسکول کی درسی کتاب سے کوئی ایک اکائی منتخب کیجیے اور اس کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

(4) گیارھویں اور بارھویں جماعت سے انگریزی کی درسی کتاب سے کوئی ایک اکائی منتخب کیجیے اور اس پر گروپ میں مباحثہ کیجیے۔

1.9: حوالہ جاتی مضامین Reference Texts

(1) Azeem H Premji, "Dancing in the Rain", Interactive English, for Intermediate II Year, Published by Telugu Academy, Hyderabad

(2) O Henry, "A Service of Love" Interactive English, for Intermediate First Year, Published by Telugu Academy, Hyd.

(3) ابوالکلام آزاد ''ذوق چائے نوشی'' مطالعہ ادب (حصہ دوم)، مرتبہ شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ، ناشر تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی، حیدرآباد

(4) مرزا فرحت اللہ بیگ ''مردہ بدست زندہ'' مطالعہ ادب (حصہ دوم)، مرتبہ شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ، ناشر تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی، حیدرآباد

(5) مولوی عبدالحق ''مولانا وحیدالدین سلیم'' گلزار ادب (حصہ دوم)، مرتبہ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن' ناشر تلگو اکیڈمی، حیدرآباد

اکائی(2) معروف مضامین پر مبنی وضاحتی تحریروں کے ساتھ مشغول رکھنا

Engaging with Popular Subject Based Expository Writing

ساخت

2.1 تمہید

2.2 مقاصد

2.3 متن(1) مولانا ابوالکلام آزاد

2.4 متن(2) کھیل کود اور تعلیم

2.5 متن(3) سلسلہ روز و شب

2.6 متن(4) Coorg

2.7 متن(5) A Truely Beautiful Mind

2.8 اکائی کے اختتام کی مشقیں Unit End Exercise

2.9 حوالہ جات (Referances)

2.1 تمہید

پچھلی اکائی میں آپ نے نویں تا بارھویں اور اعلیٰ سطح کی اردو نیز انگریزی کی نصابی کتب سے اخذ کردہ پانچ متون کا مطالعہ کیا اور ان کے مفہوم پر مختلف طریقوں سے اظہار خیال کیا۔ اس اکائی میں مزید پانچ متون دیئے جارہے ہیں۔ ان متون کا انتخاب میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ متون زیر تربیت معلمین کی دلچسپی کے موضوعات پر مبنی ہوں۔ لہٰذا پہلا متن عظیم شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح پر مبنی ہے۔ دوسرا متن ہندوستان کی ایک بے لوث خاتون فاطمہ بی پر ہے۔ بقیہ تین متون اسکولی نصاب سے لئے گئے ہیں۔ ان متون کا مطالعہ بغور کیجئے اور ان پر اظہار خیال کیجئے۔

2.2 مقاصد

اس اکائی کے تکمیل کے بعد آپ اس قابل ہوں گے کہ

☆ ادب کے مطالعہ سے ادبی ذوق کو پروان چڑھائیں

☆ مختلف موضوعات کو پڑھ کر اس پر اپنا اظہار خیال کر سکیں۔

☆ دیئے گئے متون کے معنی و مفاہیم اور معلومات کو اپنے طور پر پیش کر سکیں۔

☆ دیئے گئے متون کا خلاصہ تحریری اور زبانی پیش کر سکیں۔

☆ دیئے گئے متون کا تنقیدی جائزہ لے سکیں

2.3 متن (1)

درج ذیل مضمون ڈاکٹر نجم السحر کے مضمون ''ابوالکلام آزاد - ایک ہمہ جہت'' سے اخذ کیا گیا ہے۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ 11 رنومبر مولانا آزاد کا یوم پیدائش ہے جسے حکومت آندھرا پردیش نے ''یوم تعلیم'' کے طور پر منانے کا اعلان کیا ہے۔ مولانا آزاد جو آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے اور گیارہ برس تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ آج ان کی عظیم شخصیت پر کچھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے ان کا نام زبان پر آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص کا تذکرہ نہیں بلکہ بیک وقت کئی اشخاص زیر بحث ہیں۔ ہر شخصیت کے علم و فضل، فکر و نظر اور اخلاقی کمالات کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور اس کا قصر انہی مختلف پہلوؤں پر تعمیر ہوتا ہے۔ ایسی شخصیتیں جو ہر حیثیت سے عظیم ہوں اور ان کی شخصیت کا ہر پہلو اپنے اندر کوئی نہ کوئی انفرادیت رکھتا ہو صدیوں کی گردش لیل و نہار کے بعد صفحۂ ہستی پر نمودار ہوتی ہیں۔ مولانا آزاد کا شمار ایسی ہی ہستیوں میں ہوتا ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے علم و فضل کے بیشمار دولتوں اور فکر و نظر کی بے شمار صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ ایک بلند پایہ عالم دین تھے اور مختلف دینی علوم جیسے تفسیر، حدیث اور فقہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ تاریخ عالم کے ایک ایک گوشے اور ایک ایک پہلو پر نظر تھی۔ لسانیات، لغات اور اصطلاحات کے مسائل سے خاص دلچسپی تھی۔ عربی تو ان کی مادری زبان تھی۔ فارسی پر بھی عبور رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی سے بھی بخوبی واقف تھے۔ وہ ہر زبان کے بڑے بڑے ادیبوں، مصنفوں اور شاعروں کی تخلیقات پر ناقدانہ نظر رکھتے تھے۔

وہ ایک بہترین صحافی بھی تھے۔ اردو صحافت کے دامن میں انہوں نے اب سے تقریباً ایک صدی پہلے جو کچھ ڈال دیا تھا آج تک اس میں اضافہ نہ کیا جاسکا۔ خطابت میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ ان کی طاقت لسانی کے آگے برٹش حکومت اپنی تمام آہنی اور جنگی طاقتوں کے ساتھ لرزتی رہی۔ عملی سیاست میں انہوں نے اس وقت قدم رکھا جب بڑے بڑے رہنماؤں کا اس میدان میں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ مفکر تعلیم کی حیثیت سے وہ ہندوستان کی ایک اہم شخصیت تھے۔ ہندوستان کو انہوں نے اپنے دور وزارت میں اپنے افکار اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے مالا مال کر دیا۔

طب پر اپنی زبان کھولی تو اپنی معلومات کا بڑے بڑے حکیموں سے لوہا منوالیا مصوری میں ان کا مطالعہ اتنا وسیع اور ان کی نظر اتنی گہری تھی کہ وہ نہ صرف اس کی تاریخ بلکہ عہد بہ عہد ترقی اور ہر عہد کی خصوصیات سے واقف تھے۔

موسیقی کا ذوق ان کی طبیعت میں رچا بسا تھا۔ اس کو انہوں نے عملی لحاظ سے سیکھا اور فنی لحاظ سے اس کی تکمیل کی تھی۔ مشرقی لباس اور کھانوں کا تذکرہ ہو کہ مشرقی کوفتوں کی تاریخ وہ ہر موضوع پر اپنی معلومات اور مطالعے کی وسعت سے سننے والے کو حیرت میں ڈال دیتے تھے۔

وہ ایک باکمال شاعر بھی تھے تو دوسری طرف مفسر قرآن بھی۔ ادیب بھی تھے اور صحافی بھی۔ سیاست و ادب دونوں میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ غرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی ذات میں خود ایک انجمن تھے۔

ابوالکلام 11 رنومبر 1888ء ذوالحجہ 1305ھ مکہ معظّمہ میں پیدا ہوئے۔ والد نے ان کا تاریخی نام ''فیروز بخت'' رکھا تھا اور اس طرح اس مصرع سے استخراج کیا۔

جواں بخت و جواں طالع و جواں باد

مولانا کے سوانحی تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تین بہنیں اور ایک بھائی تھے جن میں سب سے بڑی بہن کا انتقال کمسنی میں ہی ہو گیا تھا۔

ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر والد نے دی۔ بعد میں مختلف اساتذہ جیسے مولانا محمد یعقوب دہلوی، محمد ابراہیم، شمس العلماء مولانا سعادت حسین وغیرہ سے مختلف علوم کی نصابی کتابیں پڑھیں۔ پندرہ برس کی عمر میں درس نظامی سے فارغ ہو چکے تھے۔ کھیل کود کا نہ شوق تھا اور نہ اس کے لیے فرصت تھی۔ ذہن کی تیزی کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ اپنے ہم درسوں سے آگے رہتے تھے۔ تعلیم کی مہینوں کی منزلیں دنوں میں طئے کیں۔

شاعری: شاعری کا شوق مولانا کو دس گیارہ برس کی عمر سے ہی پیدا ہو گیا۔ ان کی پہلی غزل بمبئی سے نکلنے والے گلدستہ ''ارمغان فرخ'' جنوری ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔ اپنا تخلص ''آزاد'' رکھا۔ پہلے امیر مینائی سے اصلاح لیتے تھے بعد میں شوق نیموی کے شاگرد ہوئے۔ انہوں نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہے۔

خطابت: مولانا میں خطابت کی فطری صلاحیت موجود تھی۔ اور یہ وصف انہیں توارث میں ملا تھا۔ دس گیارہ برس کی عمر میں یہ عالم تھا کہ دو دو گھنٹے بہ آسانی تقریر کر سکتے تھے۔ 1904ء میں لاہور میں انجمن حمایت الاسلام کے جلسہ میں برجستہ تقریر کی تو ان کی سحر بیانی کے چرچے سارے پنجاب میں عام ہو گئے۔

صحافت: مولانا کی صحافتی زندگی کا آغاز 1899ء میں ''نیرنگ عالم'' کی اشاعت سے ہوتا ہے۔ 1900ء میں دو سہ ہفت روزہ اخبار ''المصباح'' جاری کیا جو مصر کے اخبار ''المصباح الشرق'' کی تقلید میں تھا۔

''مولانا آزاد نے اپنے ہفتہ وار ''الہلال' سے مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا۔ یہ ایک ایسا انداز خطاب تھا جس سے ہندوستانی مسلمان آشنا نہ تھے۔ الہلال مسلمانوں کے کسی بھی مکتب خیال سے اتفاق نہیں رکھتا تھا بلکہ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا''۔

سیاست: مولانا آزاد سیاست کا پہلا سبق 1907ء کے لگ بھگ بنگال کے ان سیاسی لیڈروں سے سیکھا تھا جو وطن کی آزادی کے لیے خفیہ انقلابی تحریکیں چلایا کرتے تھے۔

1930ء میں جب نمک ستیہ گرہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا دوبارہ ایک سال سے زائد عرصہ کے لیے قید میں رکھے گئے۔

1939ء میں وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ 8/اگست 1942ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں ''ہندوستان چھوڑ دو تحریک'' کا ریزولیوشن منظور ہوا۔ اس کے دوسرے دن مولانا آزاد دوسرے کانگریسی رہنماؤں جواہر لعل نہرو، آصف علی، سردار ولبھ بھائی پٹیل، آچاریہ کرپلانی' کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے۔ انہیں پہلے احمد نگر جیل پھر بانکوڑہ جیل میں رکھا گیا۔ 15/جون 1945ء کو رہا ہوئے۔

کانگریس کے صدر کی حیثیت سے سات سال مسلسل خدمات انجام دینے کے بعد 1946ء کے صدارتی انتخاب میں صدارت سے سبکدوش ہو گئے۔ بیشتر کانگریسی اراکین چاہتے تھے کہ مولانا دوبارہ صدارت کے عہدہ پر فائز رہیں لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔ اور جواہر لعل نہرو کا نام پیش کیا اور متفقہ طور پر پنڈت نہرو کو کانگریس کا صدر منظور کر لیا گیا۔

وزارت: 15/اگست 1947ء کو ہندوستان ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے دنیا کے نقشہ پر نمودار ہوا۔ گاندھی جی کی خواہش اور اصرار پر مولانا نے اپنے لیے وزارت عظمیٰ کے بجائے وزیر تعلیم کا عہدہ پسند کیا۔ ملک کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے قوم کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں اور آخر تک اسی عہدہ پر فائز رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد 15/جنوری 1947ء تا 22/فروری 1958ء یعنی کم و بیش گیارہ برس وزیر تعلیم کے منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ عہدہ سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے انہوں نے اپنے تعلیمی نظام کو کامیاب بنانے کی غرض سے اپنی وزارت کے سکریٹری کی حیثیت سے ڈاکٹر تاراچند، پروفیسر ہمایوں کبیر اور خواجہ غلام السیدین کی خدمات حاصل کیں۔ انہوں نے تعلیم کے تقاضوں کو سمجھا اور تعلیم کو جمہوری بنانے کئی ایک اقدامات کئے۔ اسکول جانے والے تمام بچوں کو بنیادی تعلیم مفت اور لازمی قرار دیا۔ عوام میں ناخواندگی کی شرح گھٹانے اور خواندگی کو عام کرنے کئی اسکیمات روبہ عمل لائی گئیں۔ بنیادی تعلیم کے اساتذہ کے لیے

ٹریننگ کالجس کھولے گئے۔

گو کہ 22 ؍فروری 1958ء کو اس چشمۂ فیض اور ہمارے درمیان موت کی دیوار کھڑی ہوگئی لیکن ان کی زندہ جاوید تصانیف ہمارے درمیان ہیں جن سے نسلاً درنسلاً استفادہ کیا جا سکتا ہے۔!!

سرگرمیاں:

(1) اس متن میں مولانا آزاد کی زندگی کے بارے میں معلومات پیش کی گئیں ہیں اسے اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

(2) مولانا آزاد کے ادبی کارناموں کو اپنے الفاظ میں بیان کیجئے۔

(3) مولانا آزاد کی صحافت کے تعلق سے آپ کی کیا رائے ہے۔

2.4 متن (2)

درج ذیل متن جناب محمد اسحٰق کے مضمون ''کھیل کود اور تعلیم'' مشمولہ ''تعلیم ایک تحری۔ایک چیلنج'' سے لیا گیا ہے۔

کھیل کود اور تعلیم

''جب سے بچہ محلّہ کے بچوں کی صحبت میں پڑا ہے بگڑ گیا ہے۔اب اس کا جی پڑھنے میں نہیں لگتا۔جب سے کھیل کا چسکا لگا ہے نہ اس کو بھوک لگتی ہے اور نہ دھوپ چھاؤں کا خیال رہتا ہے بس صبح سے شام تک باہر رہنے لگا ہے۔'' ماں باپ کی یہ شکایتیں آپ آئے دن سنتے ہی ہوں گے ایسی شکایتیں کرتے وقت ماں باپ خود اپنے بچپن کا زمانہ بھول جاتے ہیں اور انہیں اپنی شرارتیں یاد نہیں آتیں۔اگر آپ کا بچہ کھیلتا کودتا ہے اور بچوں کے ساتھ گھل مل گیا ہے تو سمجھئے آپ خوش قسمت ہیں اور اگر کھیل کود سے دور الگ آپ کا بچہ کسی گوشہ میں خاموش بیٹھا رہتا ہے تو یہ آپ کے لیے خطرہ کی گھنٹی ہے۔کیونکہ یہ مسائلی بچہ Problem Child ہوگا جو آئندہ آپ کے لیے بہت پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔

ہر بچپن کھیل کا زمانہ ہوتا ہے۔ہر بچہ کھیلتا ہے جو بچے کھیلتے نہیں وہ بچے نہیں، کھیل کے دوران ان کی ذاتی صلاحیت، جوش، جذبہ، جدت ساری باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ان کی حقیقی مسرت کا سرچشمہ یہی کھیل ہی تو ہے۔کھیل کا صلہ خود کھیل ہے۔اگر کسی بچہ کی شخصیت جاننا چاہتے ہو تو دیکھو کھیل کے میدان میں اس کا برتاؤ کیسا ہے وہ کہاں تک کھیل کے قواعد اور اصولوں کی پابندی کرتا ہے۔کب ضد اور زبردستی پر آجاتا ہے اور کن بہانوں سے جھگڑے نکالتا ہے۔یا ناراض ہوکر میدان چھوڑ جاتا ہے۔یا پھر سب باتیں برداشت کرکے اپنی پوزیشن پر ڈٹا رہتا ہے۔کس حد تک کیپٹن کی ہدایات پر عمل کرتا ہے اور مخالف کو شکست دے کر کیسے خوشی میں ناچتا ہے اور خود ہارنے کے بعد اپنی شکست کو برداشت کرتا ہے یا گالیوں پر اتر آتا ہے۔

کسی نے یہ بات سچ کہی ہے کہ Sportsman Sprit کھلاڑی کی آن'' دیکھنا ہو تو وہ کھیل میں ہارنے کے بعد ہی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ کس خندہ پیشانی سے اپنی شکست تسلیم کرتا ہے۔کھیل کی نیرنگیاں ایسی ہیں کہ کبھی جیتنا ہوتا ہے تو اکثر ہارنا پڑتا ہے۔

ہم میں اکثر ایسے ہیں کہ جنہوں نے صرف جیتنا ہی سیکھا ہے ہارنا نہیں سیکھا'' کھلاڑی کی آن'' ایسی صفت ہے جو زندگی میں بڑے کام کی چیز ہے۔ کیوں کہ ساری زندگی جیت اور ہار، کامیابی و ناکامی، امید و بیم حسرت و یاس کے ایک طویل سلسلہ کا نام ہے۔

پروفیسر کارل گروس کی رائے ہے کہ وہ بچے کھیلنے میں زیادہ وقت صرف کرتے ہیں جن کہ والدین ان کی نگہداشت اور پرورش کرتے ہیں۔مرغی کا بچہ انڈے کے خول سے باہر آتے ہی دانہ چگنے لگتا ہے۔وہ کہتا ہے جس ذی حیات کی زندگی آئندہ چل کر جس قدر مخلوط، پیچیدہ اور ذمہ دارانہ ہوگی اتنی ہی اس کے بچپن کی مدت طویل ہوگی یہی وجہ ہے کہ انسان کا بچہ برسوں کھیلتا رہتا ہے۔پروفیسر میگڈوگل کا خیال ہے کہ بچوں میں رشک و رقابت کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کھیلتے ہیں کھیل کی جان یہی مسابقت اور مقابلہ ہے۔

کھیل کی خصوصیات:

کھیل ایک جبلی فعل ہے۔ ہر بچہ مختلف آزادانہ حرکات کرتا ہے، کودنا، بھاندنا، چیخنا، چلانا ہنسنا اور شور مچانا، گہرے سانس لینا اور بے تحاشہ زبان چلانا، لڑنا، جھگڑنا، گالی گلوج کرنا، اپنی ٹیم کے وقار کا خیال رکھنا یہ سب کچھ آپ کھیل کے دوران دیکھ سکیں گے۔ کھیل میں جذبہ، جوش اور دلچسپی کے علاوہ یہ ذہنی، جسمانی، حسی اور حرکی عمل بھی ہے۔ کھیل میں مشاہدہ توجہ، تصور، قوت فیصلہ، استدلال وغیرہ سب بیک وقت استعمال ہوتے ہیں۔ فٹبال کے کھلاڑی کو آن واحد میں فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ فٹبال کو کس زاویہ سے ٹھوکر لگائے اور گول بنائے۔ کھیل خود مقصد ہے اس کا کوئی دوسرا مقصد نہیں کھیل آپ اپنا انعام ہے۔ جو خوشی اور مسرت کھیل سے حاصل ہوتی ہے وہی اس کا حاصل ہے۔ انسانی فطرت کا اظہار بے روک ٹوک کھیل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ کھیل میں توجہ اور دلچسپی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کھیل کے دوران ماں کی پکار اور اسکول کی گھنٹی کی آواز بچوں کے کانوں میں نہیں آتی۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

(غالب)

کھیل اور تعلیم:

بچوں کو صحت مند توانا اور تندرست رہنے کے لیے کھیلنا ضروری ہے کھیل ذہنی اور عقلی تربیت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ دماغی محنت کے بعد تکان محسوس ہوتی ہے۔ کھیل کے بعد وہ پھر تازہ دم ہو جاتا ہے۔

کھیل سماجی تربیت کا اہم ذریعہ ہے۔ دوسروں کے ساتھ مل جل کر کھیلنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تنہا رہ کر زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ باہمی رشک و رقابت کے ساتھ ساتھ باہمی تعاون اور امداد کے فوائد سے وہ واقف ہوتا جاتا ہے۔ وہ ہمہ تن اپنی ٹیم اور اپنے اسکول کی خاطر جانبازی سے کوشش کرتا ہے۔ دوسروں کے خیالات وجذبات جس کا دوران کھیل آزادانہ اظہار ہوتا ہے اس سے واقف ہوتا جاتا ہے۔ اس کے خیالات میں مختلف تجربات کی بدولت درستگی، صحت اور صفائی آجاتی ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں سے بہت کچھ سیکھتا ہے جو اس کی آئندہ زندگی کا قیمتی سرمایہ بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اداروں کی ملازمتوں میں اسپورٹس مین کا انتخاب ضرور کیا جاتا ہے۔

موثر اور کارآمد تعلیم وہی ہے جو کھیل کی اسپرٹ میں دی جائے جہاں پر مقصد کا اظہار نہ ہو بلکہ صرف ذریعہ رہ جائے۔ اسکول ایک جمہوری ادارہ ہے۔ طلبہ کو غیر محسوس طریقہ پر یہ آزادی ہونی چاہیے کہ وہ خود دریافت کرنے کی مسرت سے مستفید ہوں اور انہیں اپنی خودی اور شخصیت کے اظہار کے مواقع ملیں۔

سرگرمیاں:

(1) بچوں کے لیے کھیل کود کیوں ضروری ہے؟

(2) بچوں کی صحت اور کھیل میں کیا رشتہ پایا جاتا ہے۔

(3) ''کھیل سماجی تربیت کا اہم ذریعہ ہے'' وضاحت کیجیے۔

(4) اس متن کا خلاصہ

متن (3): سلسلہ روز وشب

آج کل کہا جاتا ہے کہ بچے کی ذہنی نشو ونما پر اس کی پیدائش سے پہلے ہی ماحول اور ماں کے خیالات کا اثر پڑنا شروع ہو جاتا ہے، یہ بات کس حد تک

حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ تو ماہرین نفسیات ہی بتا سکتے ہیں لیکن میرا تجربہ اور مشاہدہ مجھے اتنا ضرور بتاتا ہے کہ بچہ، ماں باپ کی خاص طور پر ماں کی شخصیت اور خیالات کا اثر اس تربیت سے بھی زیادہ قبول کرتا ہے جو وہ اسے دیتے یا دینا چاہتے ہیں اور اس کے نقوش اتنے گہرے اور پائیدار ہوتے ہیں جس کے اچھے یا برے نتائج سے زندگی بھر وہ دوچار ہوتا رہتا ہے۔ ’’ماں کے پاؤں کے نیچے جنت‘‘ میں یہی معنی پنہاں ہو سکتے ہیں کہ وہ ماں ہی ہے جو بچے کی زندگی بناتی ہے۔

میری زندگی پر سب سے گہرا اثر کس شخصیت کا پڑا؟ اس سوال کا میرا ذہن پہلا اور بے اختیار جواب یہ دیتا ہے کہ یہ ہستی میری مشتاق فاطمہ مرحومہ کی ہے۔ یوں تو عام طور پر ہر انسان اور ہر فن کار خصوصاً اپنی ماں سے متاثر ہوتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ عام طور پر شریف انسان اپنی ماں کو بہت اونچا درجہ دیتا ہے لیکن میں جب اپنی والدہ کے بارے میں جذباتی تعلق سے قطع نظر کر کے بھی سوچتی ہوں تو بھی وہ ایک بلند اور غیر معمولی شخصیت کے روپ میں نظر آتی ہیں۔ جب وہ چار سال کی تھیں اس وقت ان کی والدہ فوت ہو گئیں تھیں اور والد صوفی منش آدمی تھے جن کو گھر، بال بچوں سے کچھ زیادہ تعلق نہ تھا، اس لیے ان کی تمام تربیت اور نگرانی دادا دادی نے کی اور اسی طرح قدرت نے انہیں اس لاثانی انسان کی تربیت سے فیضیاب ہونے کا موقع دیا۔ جس کو دنیا خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے نام سے جانتی ہے۔ میں بلاخوف تردید کہہ سکتی ہوں کہ ان کی پوتی میں وہ ساری بنیادی خوبیاں موجود تھیں جنہوں نے حالی کی شخصیت کو بے مثال بنا دیا ہے۔ وہ اپنے گھرانے کی پہلی پڑھی لکھی لڑکی تھیں جس کی تعلیم میں مولانا حالیؔ نے خود دلچسپی لی تھی۔ اگرچہ آج کل کی اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتوں سے ان کا کیا مقابلہ لیکن اگر علم کا مقصد اخلاقی قدروں کو پرکھ کر ان کو روح کی گہرائیوں میں اتار لینا ہے، اگر اس سے انسان کی ذاتی صفات اجاگر ہوتی ہیں، اگر اس کی بدولت انسان درد دل کی نعمت سے فیضیاب ہو سکتا ہے اور خدمت، ایثار، صبر اور محبت کے بیش بہا اور کم یاب جواہر سے اس کی جھولی بھر جاتی ہے یا بھر سکتی ہے تو میں کہہ سکتی ہوں کہ میری والدہ نے اپنے بہت محدود علم سے لامحدود فائدے حاصل کیے تھے۔ وہ اپنی اولاد کی تربیت، نگرانی اور اخلاقی تعلیم میں بھی ہمیشہ یہ چیز پیش نظر رکھتی تھیں کہ وہ دنیاوی کامیابی، دولت، شہرت پا سکیں یا نہیں مگر اچھے، سچے، باخدا انسان ضرور بنیں۔ خوش قسمتی سے ان کو شوہر بھی وہ ملا جو خاندان بھر کا ہیرا کہا جاتا تھا اور جس کی شرافت اور نیکی ہی کا نہیں، قابلیت ذہانت اور قومی خدمات کا بھی دور دور شہرہ تھا۔ میرے والد خواجہ غلام الثقلین اور ان کی بیوی میں جو گہری اور سچی رفاقت تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس کی وجہ سے دونوں نے ایک دوسرے کا گہرا اثر قبول کیا ہوگا لیکن والدہ عین جوانی میں اپنے سب کام ادھورے اور ننھے ننھے بچے چھوڑ کر خدا کو پیاری ہو گئیں تھیں۔ میں اس وقت پورے دو سال کی بھی نہ تھی اس لیے میں نہ ان کی ذہنی صلاحیتوں سے فیضاب ہو سکی اور نہ ان کی تعلیم و تربیت کی نعمت پا سکی۔ لیکن ہوش سنبھالتے ہی ان کا نام، ان کا ذکر، ان کی ذہانت اور قابلیت کا شہرہ ہر کسی کی زبان سے سنا۔ اپنی ماں، پھوپھیوں اور چچاؤں کو ان کے ذکر کے ساتھ آنسوؤں کا دریا بہاتے پایا، ان کی تصنیف کردہ کتابیں اور ان کی وسیع لائبریری دیکھی اور غیر شعوری طور پر ان سب کا گہرا اثر قبول کیا اور میرے کچے ذہن میں ایک آئیڈیل انسان کا جو تصور کسی گوشے میں پلتا بڑھتا رہا وہ والد کے خیالی ہیولے سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ جوں جوں میری عمر بڑھتی رہی یہ احساس شدت پکڑتا گیا کہ مجھے اس بڑے انسان کی بیٹی کہلانے کے لائق بننا ہے۔ والدہ کی شخصیت اور صفات اور ان کے تصور کا میرے ذہن نے کتنا گہرا اثر قبول کیا۔ اس کو صرف میں محسوس کر سکتی ہوں، بیان نہیں کر سکتی۔

ایک اور شخصیت میرے بڑے چچا خواجہ غلام الحسنین کی ہے جس نے میرے مذہبی عقیدوں اور اسلام کے تصور پر بہت اثر چھوڑا ہے۔ وہ بہت بڑے عالم دین تھے جنہوں نے اسلام کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور اس کی روح کو سمجھ کر اس کی صحیح تعلیم دینے کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا۔ وہ توہمات، سطحی مذہبی رسموں، غلط عقیدوں اور اوہام کا جو جال مذہب کے گرد پھیلا ہے، اس کے بڑے مخالف تھے اور انہیں اسلام کی صحیح تعلیم کے منافی سمجھتے تھے۔ اپنے خاندان کے بچوں کو اسلام کی صحیح تعلیم سے روشناس کرانے کی انہوں نے ہمیشہ کوشش کی۔ میرے بڑے بھائی سیدین صاحب نے ان ہی سے عربی اور مذہبی تعلیم کا درس لیا تھا۔ ان کے کردار میں ایک سچے عالم، ایک مرد فقیر، ایک باخدا انسان کا ایسا دلکش جلوہ نظر آتا تھا جو اسلام کے ابتدائی دور کے بعض سچے عالموں اور خادموں کا طرہ امتیاز تھا اور جن کو خاصانِ خدا کا رتبہ ملا تھا۔

بچپن میں میرے دل میں اعلیٰ تعلیم پانے کی تمنا تھی، اپنے ابا میاں اور بھائی جان کی طرح خوب پڑھوں گی، ڈگریاں لوں گی، ڈاکٹر بنوں گی، مگر میرے یہ خواب پورے نہ ہوئے۔ ہاں ایک دوسرے میدان میں اپنے پرنانا اور باپ کی ذہنی رفاقت اور روحانی شاگردی قدرت نے میرے لیے مقدر کی تھی۔

لیکن یہ سب تو سوچنے سے خیال میں آتا ہے۔ حقیقت میں جس ہستی نے میری صلاحیت کو پرکھا اور میری ذہنی نشو ونما میں نمایاں حصہ لے کر مجھے کسی قابل بنایا وہ میرے بھائی خواجہ غلام السدین ہیں۔ وہ پیدائشی معلم ہیں جن کی زندگی کی سب سے بڑی مسرت اور مقصد یہ رہا ہے کہ بچوں کو تعلیم کا شوق دلائیں۔ علم کی پیاس پیدا کریں اور ان کی قدرتی صلاحیتوں کو ابھرنے اور پنپنے کا موقع دیں اور ہمت افزائی کریں۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں ان کی سب سے پہلی طالب علم ہوں۔ مطالعے کا شوق تو مجھے ورثہ میں ملا تھا (اور سارا گھر طرح طرح کی کتابوں سے بھرا پڑا تھا)۔ جن کتابوں کا کچھ بھی حصہ سمجھ میں آجاتا وہ بس میں پڑھ لیتی تھی۔ لیکن بھائی جان نے صحیح قسم کی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا کیا اور اچھی اچھی کتابیں لاکر دیں۔ انگریزی کتابیں پڑھنے ہی کی قابلیت نہ تھی سمجھنے کی صلاحیت کہاں سے ہوتی مگر انہوں نے ہمیشہ مجھے ابھارا کہ سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں مگر میں انگریزی کتابیں پڑھتی رہوں چنانچہ مجھے یہ چاٹ بھی لگ گئی اور اس طرح انگریزی ادب اور اس کے ذریعے دوسری زبانوں کی بعض بلند پایہ کتابوں سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ شروع سے میری لکھی اوندھی سیدھی چیزوں کو پڑھتے، مشورہ دیتے اور زبان ٹھیک کرتے تھے اور بقول ان کے مذاق مذاق میں انہوں نے مجھے ادیب بنا دیا۔ تیرہ یا چودہ سال کی عمر میں میری جو سب سے پہلی کہانی رسالہ ''نورجہاں'' میں چھپی وہ انہیں کی سنائی ایک انگریزی کہانی کا چربہ تھی۔ برسوں تک میری کوئی کہانی کوئی مضمون ان کی اصلاح کے بغیر شائع نہیں ہوا۔ اب کہ وہ اتنے مصروف اور میں اتنی مشہور ہوں، اب بھی کوئی اہم چیز لکھتی ہوں تو اکثر مدت تک وہ اس انتظار میں پڑی رہتی ہیں کہ وہ پڑھ کر اس پر تنقید کریں یا صاد کریں۔

سرگرمیاں:

(1) بچے کی شخصیت پر سب سے زیادہ اثر کس کا پڑتا ہے۔

(2) اس متن میں مصنفہ نے ماں کا تذکرہ کس انداز سے کیا ہے اسے اپنے لفظوں میں بیان کیجئے۔

(3) مصنفہ نے کن شخصیات کا ذکر اپنے اس مضمون میں کیا ہے۔ اس کو مختصراً بیان کیجئے۔

2.6. Read the following text

Coorg

Midway between Mysore and the coastal town of Mangalore sits a piece of heaven that must have drifted from the kingdom of gold. This land of rolling hills is inhabited by a proud race of martial men, beautiful women and wild creatures.

Coorg, or Kodagu, the smallest district of Karnataka, is home to evergreen rainforests, spices and coffee plantations. Evergreen rainforests cover thirty percent of this district. During the monsoons, it pours enough to keep many visitors away. The season of joy commences from September and continues till March. The weather is perfect, with some showers thrown in for good measure. The air breathes of invigorating coffee. Coffee estates and colonial bungalows stand tucked under tree canopies in prime corners.

The fiercely independent people of Coorg are possibly of Greek or Arabic descent. As one

story goes, a part of Alexander's army moved south along the coast and settled here when return became impractical. These people married amongst the locals and their culture is apparent in the martial traditions, marriage and religious rites, which are distinct from the Hindu mainstream. The theory of Arab origin draws support from the long black coast with an embroidered waist-belt worn by the Kodavus, known as Kuppia, it resembles the kuffia worn by the Arabs and the Kurds.

Coorgi homes have a tradition of hospitality and they are more than willing to recount numerous tales of valour related to their sons and fathers. The Coorg Regiment is one of the most decorated in the Indian Army and first Chief of the Indian Army General Cariappa, was a Coorgi. Even now, Kodavus are the only people in India permitted to carry firearms without a licence.

The riever, Kaveri, obtains its water from the hills and forests of Coorg. Mahaseer - a large freshwater firsh-abound in these waters. Kingfishers dive for their catch, while squirrels and langurs drop partially eaten fruit for the mischief of enjoying the splash and the ripple effect in the clear water. Elephants enjoy being bathed and scrubbed in the river by their mahouts.

The most laidback individuals become converts so the life of high-energy adventure with river rafting, canoeing, rappelling, rock climbing and mountain biking. Numerous walking trails in this region are a favourite with trekkers.

Birds, bees and butterflies are there to give you company. Macaques, Malabar squirrels, langurs and slender lorts keep a watchful eye from the tree canopy. I do, however, prefer to step aside for wild elephants.

The climb to the Brahmagiri hills brings you into a panoramic view of the entire misty landscape of Coorg. A walk across the rope bridge leads to the sixty - four - acre island of Nisargadhama. Running into Buddhist monks from India's largest Tibetan settlement, at nearby Bylakuppe, is a bonus. The monks, in red, ochre and yellow robes, are amongst the many surprises that wait to be discovered by visitors searching for the heart and soul of India, right here in Coorg.

Activities:

(1) Where is coorg?

(2) What do you know about

 (a) The people of Coorg

 (b) The main crop of Coorg?

 (c) The sprats it offers to tourists?

(3) Describe the scenic beauty of Coorg as depicted in this text in your own words.

2.7. Read the following text

A Truly Beautiful Mind

1. Albert Einstein was born on 14 March 1879 in the German city of Ulm, without any

indication that he was destined for greatness. On the contrary, his mother thought Albert was a freak. To here, his head seemed much too large.

2. At the age of two - and -a -half, Einstein still wasn't talking. When he finally did learn to speak, he uttered everything twice. Einstein did not know what to do with other children, and his playmates called him "Brother Boring". So they youngster played by himself much of the time. He especially loved mechanical toys. Looking at his newborn sister, Maja, he is said to have said: "Fine, but where are her wheels?

3. A headmaster once told his father that what Einstein chose as a profession wouldn't matter, because "He'll never make a success at anything". Einstein began learning to play the violin at the age of six, because his mother wanted him to; he later became a gifted amateur violinist, maintaining this skill throughout his life.

4. But Albert Einstein was not a bad pupil. He went to high school in Munich, where Einstein's family had moved when he was 15 months old, and scored good marks in almost every subject. Einstein hated the school's regimentation, and often clashed with his teachers. At the age of 15, Einstein felt so stifled there that he left the school for good.

5. The previous year, Albert's parents had moved to Milan, and left their son with relatives. After prolonged discussion, Einstein got his wish to continue his education in German-speaking Switzerland, in a city which was more liberal than Munich.

6. Einstein was highly gifted in mathematics and interested in physics, and after finishing school, he decided to study at a university in Zurich. But science wasn't the only thing that appealed to the dashing youngh man with the wairus moustache.

7. He also felt a special interest in a fellow student, Mileva Maric, whom he found to be a "clever creature". This young Serb had come to Switzerland because the University in Zurich was one of the few in Europe where women could get degrees, Einstein saw in her an ally against the "philistines" - those people in his family and at the university with whom he was constantly at odds. The couple fell in love. Letters survive in which they put their affection into words, mixing science with tenderness. Wrote Einstein: "How happy and proud I shall be when we both have brought our work on relativity to a victorious conclusion".

8. In 1900, at the age of 21, Albert Einstein was university graduate and unemployed. He worked as a teaching assistant, gave private lessons and finally secured a job in 1902 as a technical expert in the patent office in Bern. While h was supposed to be assessing other people's inventions, Einstein was actually developing his own ideas in secret. He is said to have jokingly called his desk drawer at work the 'bureau of theoretical physics".

9. One of the famous papers of 1905 was Einstein's special theory of relativity, according to which time and distance are not absolute. Indeed, two perfectly accurate clocks will not continue to show the same time if they come together again after a journey if one of them has been moving very fast relative to the other. From this followed the world's most famous

formula which describes the relationship between mass and energy:

$$E=mc2$$

10. While Einstein was solving the most difficult problems in physics, his private life was unraveling. Albert had wanted to marry Mileva right after finishing, his studies, but his mother was against it. She thought Mileva, who was three years older than her son, was too old for him. She was also bothered by Mileva's intelligence. "She is a book like you", his mother said. Einstein put the wedding off.

11. The pair finally married in January 1903, and had two sons. But a few years later, the marriage faltered. Mileva, meanwhile, was losing here intellectual ambition and becoming an unhappy housewife. After years of constant fighting, the couple finally divorced in 1919. Einstein married his cousin Elsa the same year.

2.8 اکائی کے اختتام کی مشقیں

(1) ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح کے مختلف مضامین (زبان و غیر زبان) کی درسی کتب سے چند متون کو منتخب کیجیے۔ اور ان کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

(2) اپنے ہم عمر ساتھیوں (Peers) کے ساتھ گروپ تشکیل دیجیے اور مختلف عنوانات پر متون کا انتخاب کرتے ہوئے ان کا مطالعہ کیجیے اور پھر ان متون کا تنقیدی جائزہ اپنے گروپ میں پیش کیجیے۔

حوالہ جات:

(1) ڈاکٹر نجم السحر ''مولانا ابوالکلام آزاد''

(2) محمد اسحاق ''کھیل کود اور تعلیم''، مشمولہ ''تعلیم ایک تحریک، ایک چیالنج''، کل ہند تعلیمی تحریک، نئی دہلی۔

(3) صالحہ عابد حسین ''سلسلہ روز و شب''، مشمولہ ''گلزار ادب (دوم) بورڈ آف انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن، حیدرآباد۔

(4) " A Truely Beautiful Mind" - Beehive, Text Book in English for Class IX (NCERT)

(5) "Coorg" First Flight, Text Book in English for Class X (NCERT)

اکائی (3) صحافتی تحریروں کے ساتھ مشغول رکھنا

Engaging with Jourualistic Writing

ساخت:

3.1 تمہید
3.2 مقاصد
3.3 متن (1) اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے ٹرمپ کا خطاب
3.4 متن (2) جی ایس ٹی ملک کے محاصلی اور مالیاتی نظام کی ناکامی کی تصویر
3.5 متن (3) تدریس ایک فن ہے
3.6 متن (4) Re-imaginning the OBC Quota
3.7 متن (5) The Legal Status of Animals
3.8 اکائی کے اختتام کی مشقیں Unit End Exercise
3.9 حوالہ جات (Referances)

3.1 تمہید

جیسا کہ ابتداء میں بتایا جا چکا ہے کہ اس کورس کو شامل نصاب رکھنے کا مقصد طلباء میں مطالعہ کی عادت کو فروغ دیں اور مطالعہ کئے جانے والے متون کے معنی و مفہوم تک رسائی حاصل کرنا اور پھر ان پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ لہٰذا آپ نے پہلی اکائی میں واقعات پر مبنی متون کا مطالعہ کیا ہے اور دوسری اکائی میں مضمون پر مبنی وضاحتی متون کا مطالعہ کیا۔ اب اس اکائی میں آپ اخبارات و رسائل میں شائع صحافتی و غیر صحافتی متون کا مطالعہ کریں گے اور پھر اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔

3.2 مقاصد

اس اکائی میں دیئے گئے متون کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہوں گے کہ

☆ اخبارات میں شائع شدہ صحافتی مضامین پڑھ کر اس کے مفہوم کو سمجھ سکیں

☆ صحافتی مضامین کے مطالعہ کے بعدان پر اظہار رائے کرسکیں۔

☆ صحافتی وغیر صحافتی متون کے فرق کو سمجھ سکیں۔

3.3 درج ذیل متن کو غور سے پڑھیئے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے ٹرمپ کا خطاب

گزشتہ نو ماہ میں جب سے وہ امریکہ کے صدر بنے ہیں ڈونلڈ ٹرمپ نے شمالی کوریا پر متعدد بار سخت جملے استعمال کیے ہیں۔کبھی آگ اور غیض وغضب کی نمائش کی دھمکی دی ہے تو کبھی کم جونگ ان کو ایسا سبق سکھانے کا عہد کیا جو وہ کبھی بھول نہیں سکیں گے۔تاہم منگل کے دن ٹرمپ نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاس میں شمالی کوریا کے خلاف جارجیت اور زہر افشانی کی تمام حدیں پار کرلیں۔ یہ سچ ہے کہ شمالی کوریا کے صدر ایک ذہنی طور پر غیر متوازن جابر ڈکٹیٹر ہیں جن کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں سے ان کے پڑوسی ممالک نالاں ہیں۔لیکن ٹرمپ نے اپنی تقریر میں صرف کم جونگ ان اور ان کی ملٹری کو نشانہ نہیں بنایا بلکہ پورے شمالی کوریا اور اس کے ڈھائی کروڑ عوام کا صفحۂ ہستی سے نام و نشان مٹا دینے کی دھمکی بھی دے ڈالی۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد اقوام متحدہ کی بنیاد اس مقصد کے تحت رکھی گئی تھی کہ مستقبل میں اگر دوبارہ سے زیادہ ممالک کے درمیان کسی وجہ سے کوئی تنازع پیدا ہو تو مذاکرات کے ذریعہ اس کا مثبت حل ڈھونڈ لیا جائے تاکہ خطے میں امن قائم رہے۔اقوام متحدہ جنگ کو ٹالنے اور بین الاقوامی تنازعوں کے سفارتی حل کی حصولیابی کا سب سے بڑا عالمی پلیٹ فارم ہے۔ٹرمپ کے ریکارڈ کے پیش نظر یہ خدشہ تو تھا کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ان کی افتتاحی تقریر بے حد تلخ ہوگی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ امید بھی تھی کہ شاید وہ عالمی لیڈروں کی موجودگی میں اس متانت، بردباری اور تحمل کا مظاہرہ کریں گے جو دنیا کے واحد سپر پاور کے سربراہ سے متوقع ہے۔

لیکن ٹرمپ نے بھلا پہلے کبھی کسی کی پرواہ کی تھی جو اب کرتے۔انہوں نے شمالی کوریا کے سربراہ کم جونگ کو حقارت سے ''راکٹ مین'' کا نام دے کر کہا کہ وہ خودکشی کی راہ پر گامزن ہیں۔اور اس کے بعد ٹرمپ نے وارننگ دی کہ اگر شمالی کوریا ایٹمی تجربات اور بالسٹک میزائل کے تجربات بند نہیں کرتا تو وہ اس چھوٹے اور غریب ملک کو مکمل طور پر تباہ کردیں گے۔

امریکہ کے معتبر اخبار واشنگٹن پوسٹ کے ایک کالم نویس کے مطابق اقوام متحدہ میں اپنی پہلی تقریر میں امریکی صدر ایک مدبر اور دانا سیاستداں کی مانند نہیں بلکہ کسی ''مافیا سرغنہ'' کے انداز میں بول رہے تھے۔ٹرمپ شاید یہ بھول گئے تھے کہ وہ اریزونا یا کسی اور امریکی ریاست میں ریپبلکن پارٹی کے ورکرز کی ریلی سے نہیں بلکہ ایک عالمی ادارے کے اسٹیج سے پوری دنیا سے خطاب کر رہے تھے۔ نیویارک ٹائمز نے اپنے اداریہ میں اسی نکتہ کو یوں اجاگر کیا:

''اقوام متحدہ وہ مقام نہیں ہے جہاں سے کوئی یہ توقع کرے کہ جنگ کی دھمکی دی جائے گی۔

تاہم صدر ٹرمپ نے جنرل اسمبلی میں اپنی افتتاحی تقریر میں بالکل یہی کام کیا''۔

ایک اور امریکی اخبار تو ٹرمپ کی تقریر سے اس قدر مایوس ہوا کہ اس نے اپنے اداریہ کا یہ عنوان لگایا ''پاگل آدمی کون ہے، کم یا ٹرمپ''؟

یہاں قارئین کو یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ ٹرمپ کم جونگ کے بارے میں یہ کہہ چکے ہیں کہ وہ پاگل شخص ہے جس کے پاس جوہری ہتھیار موجود ہیں۔ پچھلے ماہ برطانیہ کے اخبار ''دی گارجین'' میں معروف کالم نویس نک کوہین کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا عنوان ہی پوری کہانی بیان کرتا ہے:

"It takes one mad man to press the button. We have two".

جب سے ٹرمپ نے وائٹ ہاؤس میں قدم رکھا ہے تب سے امریکہ میں بھی ان کے ناقدین اور میڈیا کو اس بات کا شبہ ہے کہ وہ نفسیاتی مریض ہیں۔

شمالی کوریا کے کم کے بارے میں تو عالمی برادری کو یہ یقین ہے کہ ان کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ ساری دنیا کے مخالفت اور امریکہ کے سخت دباؤ کے باوجود کم بار بار بالسٹک میزائل داغ رہے ہیں۔ امریکہ کی ایما پر اقوام متحدہ نے شمالی کوریا کے خلاف پابندیاں عائد کر کے اس کی نکیلیں کسنے کی بھرپور کوشش کی۔ ان سب کے باوجود کم ٹرمپ کی دھمکی کا جواب نہ صرف دھمکی سے دیتے ہیں بلکہ ہر دھمکی کے بعد پہلے سے زیادہ طاقتور میزائل اور دور تک مار کرنے والا میزائل داغ دیتے ہیں۔ امریکہ تمام تر کوششوں کے باوجود شمالی کوریا کو جوہری تجربات سے باز رہنے پر مجبور نہیں کر سکا ہے۔ پچھلے چند ہفتوں میں جاپان پر نشانہ سادھ کر پیونگ یانگ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اس کا یہ دعویٰ بے بنیاد نہیں ہے کہ وہ بہت جلد ایسے میزائل تیار کر لے گا جو امریکہ کے سان فرانسسکو اور سیٹل تک مار کر سکیں گے۔ واشنگٹن کو اب یہ ڈر بھی ستانے لگا ہے کہ کم گوام جزیرہ پر واقع امریکی فوجی اڈہ کو تباہ نہ کر دیں۔

ٹرمپ نے چالیس منٹ کی اپنی تقریر میں دوبار سابق امریکی صدر ہیری ٹرومین کا ذکر کیا۔ ٹرومین نے ہی دوسری جنگ عظیم کے اخیر میں 1945ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے کا حکم دیا تھا۔ وہ فیصلہ بے شک انسانی تاریخ کا سب سے بڑا جنگی جرم تھا۔ ان 72 سالوں میں دنیا میں بہت سی جنگیں ہوئی ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ جوہری ہتھیاروں کا استعمال کسی ملک نے نہیں کیا جبکہ آج درجن بھر ممالک کے پاس ایٹم بم موجود ہیں۔

ٹرمپ اور کم کے درمیان جو رسہ کشی جاری تھی اس میں اگست اور ستمبر مہینوں میں سنگین حد تک اضافہ ہو گیا۔ دونوں کے درمیان پہلے زبانی جنگ ہوئی اور اس کے بعد دونوں فریقین نے اپنی اپنی فوجی طاقت کا مظاہرہ کر کے ایک دوسرے کو اجتماعی تباہی کی دھمکیاں دے ڈالیں۔ ستمبر کے اوائل میں شمالی کوریا نے یہ اعلان کر کے ساری دنیا کو دہشت زدہ کر دیا کہ اس نے چھٹا اور اب تک کا سب سے بڑا جوہری تجربہ کر لیا ہے۔ اب پیونگ یانگ کے پاس ایک طاقتور ہائیڈروجن بم بھی ہے اور یہ صلاحیت بھی کہ وہ اسے بالسٹک میزائل کے ذریعہ ہزاروں کلومیٹر دور کسی بھی براعظم پر گرا سکتا ہے۔

واشنگٹن میں ایک ہنگامی میٹنگ کے بعد دفاعی سکریٹری جیمس میٹس نے میڈیا کے سامنے یہ اعلان کیا کہ ٹرمپ ایسی دھمکیوں کا زبردست عسکری جواب دیں گے جو موثر اور ہمہ گیر ثابت ہوگا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ امریکہ شمالی کوریا کو مکمل طور پر نیست و نابود کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے وہ صرف وہاں حکومت تبدیل کرنے کا خواہشمند ہے۔ دس دن قبل اقوام متحدہ میں امریکی سفیر نکی ہیلی نے سیکورٹی کونسل میں شمالی کوریا کے خلاف سخت پابندیوں کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ''جنگ کے لیے بے چین ہے''۔ جبکہ ٹرمپ کی تقریر سے یہ صاف ظاہر تھا کہ امریکہ بھی جنگ کے لیے بے قرار ہے۔ یعنی امریکہ اور شمالی کوریا تیزی سے تصادم کی راہ پر بڑھ رہے ہیں۔ ڈر اس بات کا ہے کہ یہ جنگ ایٹمی جنگ کا روپ اختیار نہ کر لے۔ ٹرمپ نے اپنی تقریر میں یہ لن ترانی کی کہ امریکہ اپنی دفاعی ضروریات پر 700 ملین ڈالر خرچ کرنے والا ہے اور اس کی فوج بہت جلد مضبوط ترین فوج بن جائے گی۔ لیکن وہ یہ بات نہیں سمجھ رہے ہیں کہ خواہ ان کی ملٹری کتنی بھی طاقتور کیوں نہ ہو کوریا بحران پر فوجی کارروائی کے ذریعہ قابو نہیں پا سکتا۔ اگر ٹرمپ نے طاقت کے زعم میں جزیرہ نما کوریا پر حملہ کیا تو اس کے بھیانک نتائج ہوں گے۔ شمالی اور جنوبی کوریا اور جاپان کے لاکھوں بے گناہ شہری اور خطے میں تعینات امریکی افواج مارے جائیں گے۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اگر جنگ ہوئی تو کم جونگ ان جوہری ہتھیار استعمال کرنے سے نہیں چوکیں گے۔

ٹرمپ کی اقوام متحدہ کی تقریر سے یہ بات واضح ہو گئی کہ انہوں نے کوریا تنازع کو اپنی نااہلی اور جنگی جنون کے باعث ایک بحران میں تبدیل کر دیا ہے۔ وہ امریکہ کو ایک قطعی غیر ضروری اور تباہی والے جنگ کی سمت دھکیل رہے ہیں۔ اس بحران سے نمٹنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے مذاکرات کا راستہ۔ ایک حالیہ سروے سے پتہ چلا ہے کہ 56 سے 80 فیصد امریکی عوام بات چیت کے ذریعہ اس مسئلہ کا حل چاہتے ہیں۔ پہلے بھی امریکی حکومت شمالی کوریا کے ساتھ ایٹمی تنازع کا سفارتی حل نکال چکی ہے۔

سرگرمیاں:

(1) اس مضمون میں مضمون نگار نے ٹرمپ کی کون سی خصوصیات بتائی ہیں۔

(2) اس مضمون کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجئے۔

(3) مضمون نگار نے ٹرمپ اور کم جونگ کا تقابل کس طرح کیا ہے؟ اپنے الفاظ میں بیان کیجئے۔

3.4 دیئے گئے متن کو غور سے پڑھیئے۔

جی ایس ٹی ملک کے محاصلی اور مالیاتی نظام کی ناکامی کی تصویر

ایک سوال آج کل ہم سب کو جو پریشان کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ کیا مرکزی حکومت کنٹرول کھو چکی ہے؟ اور کئی محاذ پر یہ بات سچ نظر آتی ہے۔ سماجی ملبوس کو تار تار کیا جا چکا ہے اور خصوصاً ''گائے کی پٹّی'' میں اسے پوری طرح تباہ کیا جا چکا ہے۔ گائے کے محافظوں نے کئی مقامات پر قتل اور تباہی مچادی ہے اور جن پولیس والوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی ان پر حملے بھی کئے گئے ہیں۔ جن لوگوں نے وزیراعظم اور ان کے خوشامدی ٹولے کے خلاف آوازیں بلند کیں انہیں مارا پیٹا گیا۔

تاہم سب سے فکر کی بات یہ ہے کہ حکومت نے پوری معیشت پر قبضہ کر رکھا ہے۔ پیداوار گھٹ چکی ہے اور بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ ایندھن کے داموں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ برآمدات سست رفتار ہو رہی ہیں اور درآمدات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ سونے کی درآمدات حالیہ عرصہ میں بڑھ چکی ہیں۔ حصص مارکیٹ میں اچھال کی حکومت خوشیاں منا رہی ہیں مگر اب وہ بھی ڈھیر ہو رہا ہے۔ ڈالر دوبارہ تقریباً 65 روپیوں تک پہنچ چکا ہے۔ غرض تمام محاذوں کی خبریں افسوسناک ہیں۔

اس انحطاط کی متعدد وجوہات ہیں۔ بعض داخلی اسباب ہیں اور بعض دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کے اثرات ہیں۔ اس کے لیے جزوی طور پر ٹرمپ انتظامیہ بھی ذمہ دار ہے کیونکہ ان کی وجہ سے سافٹ ویئر اور ماورئی وسائل شعبوں میں روزگار کے مواقع گھٹ گئے۔ شمالی کوریا کے ہائیڈروجن بم کے تجربہ کے خطرے نے عالمی سرمایہ کاروں میں خوف و ہراس پیدا کر دیا ہے۔ خلیج کے غیر یقینی حالات کے سبب برآمدات اور ملازمتوں کا نقصان الگ ہو رہا ہے اور اس سے غیر مقیم ہندوستانی باشندوں کی جانب سے روانہ کئے جانے والے زرمبادلہ میں بھی کمی واقع ہو رہی ہے۔ مشہور معاشی ماہر جین ڈریز کے الفاظ ہیں۔ نوٹ بندی کی مثال ایسی تھی جیسے ایک تیز رفتار موٹر گاڑی کے ٹائروں پر فائر کر دیا جائے۔ اس اقدام نے معاشی رفتار کو کم کر دیا اور چھوٹی صنعتوں کے شعبہ کی کمر توڑ دی اور صارفین کے مصارف کی سطح کو گھٹا دیا جس کے نتیجہ میں اشیاء کی طلب کم ہوگئی۔

اور اب جی ایس ٹی کے نتیجہ میں ایک اور انحطاط واقع ہو رہا ہے۔ اپنی اصل شکل میں جی ایس ٹی ایک واحد، سادہ، غیر پیچیدہ ٹیکس تھا جو تمام سابق پرانے محاصلی نظام سے وابستہ الجھنوں اور بالراست نظام جو ہندوستان میں رائج تھا اس کی پیچیدگیوں کو ختم کر سکتا تھا۔

جب اس کا نفاذ عمل میں آیا تو سارے پھوڑے ابھر آئے۔ جی ایس ٹی کے نفاذ سے پتہ چلتا ہے کہ پالیسی سازی کا نظام ایک عمدہ موقع کو کس طرح ایک مصیبت میں تبدیل کر سکتا ہے۔ سب سے پہلے اس سلسلہ میں جو فوری احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس مسئلہ سے نہایت ہی جنگلی پن سے نمٹا گیا۔ ریاستوں کو عملاً نئے محاصلی نظام کو قبول کرنے کے لیے دھمکایا گیا اور انہیں نشانہ بنایا گیا۔ غیر راست محاصل ہندوستانی آئین کے مطابق ریاست کی ذمہ داری ہیں اور مرکز کو چاہئے تھا کہ ریاستوں کو اس کے لیے راغب کرتا۔ اس کی وضاحت کی جاتی اور انہیں اعتماد میں لیا جاتا لیکن دستور کی ان دفعات ہی پر سوار ہو کر ریاستوں پر اسے مسلط کر دیا گیا جس سے بعض ریاستوں میں ناراضگی پھیل گئی۔

دوسرا مسئلہ یہ رہا کہ بنیادی اصولوں کو اندھا دھند نظر انداز کیا گیا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ سارے ملک کا ایک ہی قانون ہو مگر اصل میں کیا ہوا محاصل کے پانچ درجہ یا سطحیں ہو گئیں اور الکحل اور ایندھن جی ایس ٹی کی حد سے نکل گئے۔ محاصل کی زیادہ سے زیادہ سطح 28 فیصد اور کم سے کم صفر فیصد رہی۔ محاصل کی مختلف

سطحوں کا کوئی جواز نہیں پایا جاتا۔ بہت سے محصول دہندگان کو یہ نہیں معلوم کہ وہ کن اجزاء پر کتنا ٹیکس ادا کریں کیونکہ شرحیں مختلف ہیں۔

تیسرا مسئلہ ٹیکس کی معافی کو سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے جو انتہائی پیچیدہ ہے اور برآمدات کے شعبہ سے کس طرح نمٹا جائے یہ ایک مسئلہ ہے۔حکومت کو 65 ہزار کروڑ روپیوں کی واپسی کا مسئلہ بھی درپیش ہے جن لوگوں نے محاصل ادا کردیئے گئے ہیں ان کی وجہ سے برآمد کنندگان کو نقدی کی قلت کا سامنا ہے۔ایسی صورتحال میں جس میں برآمدات میں رکاوٹ واقع ہوچکی ہے اور وہ سست رفتار ہوچکی ہیں جو حکومت کے لیے ایک اور دھکا ہے۔

جی ایس ٹی کے نفاذ سے قبل ٹکنالوجی اور اساسی ڈھانچہ جو سکون میں تھے ان میں بھی بدنظمی پیدا ہوگئی ہے۔وزیر مالیات نے ٹیکس بھرنے والوں سے اپیل کی ہے کہ وہ آخری دن ٹیکس زیادہ تعداد میں نہ بھریں کیونکہ ٹکنالوجی کی کمر یہ بوجھ برداشت نہ کرسکے گی اور ٹوٹ جائے گی۔انہوں نے یہ بات اس وقت کہی جب ای ایس ٹی کے نیٹ ورک صرف 85 لاکھ اداروں تک محدود پائے گئے اور یہ جملہ ٹیکس دہندگان کے 50 فیصد سے بھی کم ہیں اور ان کا تعلق ماہانہ تختہ جات بھرنے والوں سے ہے۔

سرگرمیاں:

(1) مضمون نگار نے ملک میں معاشی انحطاط کے کیا اسباب بتائے ہیں۔

(2) جی ایس ٹی کے نفاذ سے کون سے مسائل پیش آرہے ہیں۔تبصرہ کیجئے۔

(3) ہندوستانی مالیاتی نظام کی خوبیوں اور خامیوں پر اپنے گروپ میں بحث کیجئے۔

3.5 دیئے گئے متن کا مطالعہ کیجئے۔

تدریس ایک فن ہے
(Teaching is an Art)

کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ (66-1964) کا پہلا جملہ یوں شروع ہوتا ہے۔ The Destiny of Inda is now being shaped in her class rooms ہندوستان کی قسمت کی تشکیل اب اس کے کلاس رومس میں ہورہی ہے۔ یہ جملہ بہت معنی خیز ہے۔اس رپورٹ کے تیار کرنے والوں نے بہت گہری اور بنیادی بات پر انگلی رکھ دی ہے اس ایک جملہ کی تشریح کے لیے انہیں ایک ہزار صفحات کی رپورٹ تیار کرنی پڑی۔آزاد ہندوستان کی تعلیمی،معاشی،سماجی،فنی،سائنسی،جمہوری نظام کی تعلیم و تربیت ان ہی کلاس رومس میں ہوگی۔

پڑھانے سے متعلق ایک عام غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ ہر وہ شخص بچوں کو پڑھا سکتا ہے جو بچہ کی معلومات سے چند قدم آگے ہوتا ہے بچہ کو سیکھنا ہوتا ہے ٹیچر کو پڑھانا، پڑھانے میں کیا پڑھانا، کب پڑھانا اور کیسے پڑھانا، یہ چاروں باتیں اہم ہیں کیا پڑھانے کے لیے سبق کا مواد اور تیاری ضروری ہے۔کب پڑھانے کے لیے اسکول کا ٹائم ٹیبل بتادے گا۔کس کو پڑھانا ہے۔بچوں کو،کس عمر کے ہیں،کس قابلیت کے ہیں،کس ماحول سے آرہے ہیں،ان کی کمزوریاں کیا ہیں اور ان کی صلاحیت کا معیار کیا ہے۔اس لیے کہا جاتا ہے کہ استاد کو نہ صرف یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اس کو کیا پڑھانا ہے،اس مضمون پر اسے کتنا عبور ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بچہ کو جاننا، پہچاننا اس سے، بھی زیادہ ضروری ہے۔اگر وہ بچہ یہ طالب علم کو پوری طرح نہیں جانتا تو اس کی بہت سی محنت رائیگاں جائے گی۔بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ،غصہ اور سزا جھلاہٹ سے خود استاد کی خامیوں کو عیاں کرتی ہیں۔

اصل سوال کیسے پڑھانے کا ہے یہی سوال اس مضمون کی جان ہے۔اکثر ٹیچر پڑھاتے نہیں وہ صرف نصاب کی تکمیل کردیتے ہیں۔ذاکر حسین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آج کل تعلیم کہاں دی جاتی ہے۔ٹیچر کی نوٹ بک سے طلبہ کے نوٹ بک میں منتقل ہوجاتی ہے۔پروفیسر ہمایوں کبیر نے لکھا ہے کہ تعلیم کوئی ایسا

عمل نہیں جیسے کسی نے پانی ایک بکٹ سے دوسری بکٹ میں انڈیل دیا ہو۔ جب تک تعلیم یا سیکھنے کا عمل Learning Process طلبہ کے ذہن ودماغ بلکہ روح کے واسطوں سے نہ ہو وہ تعلیم نہیں ہو پاتی۔

دینی درسگاہوں میں زیادہ تر بجائے غور وفکر، ذہن اور دماغ پر بار ڈالنے کے رٹنے پر زور دیا جاتا ہے۔ یہاں پر رٹو حافظہ کی قدر بڑھ جاتی ہے۔ رٹنے کے لیے کسی بات کو بار بار پڑھنا اور دہرانا ضروری ہوتا ہے لیکن یہاں تعلیم کا عمل کم رہ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کوئی تعلیمی سند تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن ان میں وہ دانشوری پیدا نہیں ہوتی جو کسی عالم دین کی شان ہوتی ہے۔

Talk and Chalk Method of Teaching بات اور چاک پیس کے استعمال کا طریقہ بھی اب فرسودہ ہو چکا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جدید سائنٹفک طریقہ ہائے تدریس اس قابل ہیں کہ انہیں کلاس رومس میں جلد از جلد اپنا لیا جائے۔

کلاس روم کی تعلیم میں اصل لین دین، سوال جواب، طلبہ میں سوچنے، سمجھنے اور حقیقت کے انکشاف کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ اسی ترکیب سے ان میں تعلیم کا ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے۔ یہی اصل میں تعلیم کا جوہر ہے یا Essence of Teaching ہے۔ جیسا ہر فن کے سیکھنے کے بعد اس علم کو معروضی حالات پر منطبق کرنے، صحیح نتائج حاصل کرنے اور اس کی معنویت کو پانے کے لیے Internship ضروری ہے۔ اسی طرح ہر ٹیچر کے لیے عملی لیباریٹری۔ یعنی کلاس روم میں انہیں آزمانے کی ضرورت ہے۔ کسی ٹیچر یا پروفیسر کا کمال یہ نہیں کہ وہ اپنے مضمون کا کتنا بڑا ماہر ہے بلکہ اس کا اصل کمال یہ ہے کہ اس نے خود اپنے جیسے کتنے باکمال شاگرد پیدا کیے ہیں۔ ان میں وہ جستجو اور علم کا ذوق کمال حاصل کرنے کے لیے انہیں کن کن تدابیر سے سنوارا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرائمری سے لے کر گرایجویشن سطح تک کوئی ساٹھ ستر اساتذہ پڑھاتے ہیں۔ لیکن وہ طالب علم ان تمام میں صرف دو چار ٹیچرس کو ہی یاد رکھتا ہے جنہوں نے سچ مچ اس کی تعلیم و تربیت میں بلکہ اس کی شخصیت میں کچھ ایسا گارا اور چونا بھر دیا جس کی تفصیل اور تشریح بیان سے قاصر ہے۔

بچوں کا معیار تعلیم وہ نہیں ہے جو کبھی عہدیدار یا انتظامیہ کے لوگ انسپکشن کے وقت معلوم کرتے ہیں۔ وہ معیار پچھلے برسوں کی تعلیم کے نتیجہ کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اصل معیار تعلیم ہر ٹیچر کا وہ جذبہ اور لگن ہے جو وہ اپنے طلبہ میں تعلیم سے متعلق پیدا کرتے ہیں۔ اگر سب اساتذہ میں یہی جذبہ پیشہ میں کارفرما ہے تو پھر یہ اجتماعی شکل میں بچوں کے معیار تعلیم میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ خود اس معیار کے لیے اساتذہ کی تعلیم و تربیت، تجربہ اور جذبہ اہمیت رکھتے ہیں۔

ہر تعلیم ایک تجربہ اور ہر تجربہ کچھ نہ کچھ سکھا دیتا ہے۔ اسی سیکھنے کی رفتار سے بچہ کی شخصیت میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ شخصیت کی تشکیل، جسم و جان۔ ذہن ودماغ پر ہزاروں عوامل کے اثرات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ سیکھنے، سمجھنے اور سوچنے کے دوران بچہ کے کردار، سمجھ بوجھ اور برتاؤ میں عظیم تبدیلیاں لانے کے بعد شخصیت کا ایک نمونہ ہمارے سامنے آتا ہے جس میں اعتدال، توازن، اپنی ذات پر بھروسہ یا خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک اچھے آرٹسٹ کی تخلیق آرٹ کا ایک نمونہ ہوتی ہے۔ ایک اچھے ٹیچر کا ہر سبق کا ایک فن پارہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی ٹیچر اس معیار پر اتر جائے تو وہ بھی ایک بڑا آرٹسٹ ہے۔ اس کی کسوٹی یہ ہے کہ ایک پوشیدہ مسرت سے بچوں کے چہرے دمک اٹھیں ان کے دل میں ٹیچر کی عزت وعظمت پیدا ہو جائے اس احساس سے ٹیچر کو جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ خود اس کا انعام ہے جو کسی انعام اور تعریف کا محتاج نہیں۔ بچہ کی تعلیم و تربیت اور شخصیت کی تعمیر کا زمانہ دنیا کی ساری مخلوقات میں طویل ترین زمانہ ہے یہی وجہ ہے کہ جس آرٹ کے نمونہ کی تخلیق مقصود ہے وہ دنیا کے ساری مخلوقات میں طویل ترین زمانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس آرٹ کے نمونہ کی تخلیق مقصود ہے وہ دنیا کے سارے فنون میں سب سے اعلیٰ ترین اور مشکل ترین فن ہے جو مختلف عوامل کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ اثر انداز ہونے والا عامل کلاس روم کی تدریس، ٹیچر کی شخصیت اور اس کے پڑھانے کا موثر انداز ہے۔

رنگ ہو یا خشت وسنگ، چنگ ہو یا حرف وصوت

معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

یہ خونِ جگر دراصل اپنے پیشہ اور فن سے عشق یا خلوص کا نام ہے جس کی کرامات بے حساب ہیں۔

سرگرمیاں:

(1) اس مضمون میں مضمون نگار نے تدریس کو کیوں فن قرار دیا ہے؟ اپنے الفاظ میں بیان کیجئے۔

(2) مضمون نگار کے خیالات سے آپ کس حد تک متفق ہیں؟ مدلل وضاحت کیجئے۔

(3) استاد اور آرٹسٹ میں کیا مماثلت پائی جاتی ہے۔

3.6. Read the following text

Reimagining the OBC quota

Sub-categorisation of OBCs provides an opening to ensure social justice works better

Regardless of the political impulse that led the government to announce creation of a committee to look into sub-categorisation of Other Backward Classes (OBC), it provides an opening to ensure social justice in an efficient manner. The biggest challenge India faces is that the groups perceived to be disadvantaged consist of a very large segment of Indian society, while public policies are highly limited in scope.

The Jobs-claimants mismatch

Some illustrative statistics are eye-opening. The National Sample Survey (NSS) data from 2011-12 show that about 19% of the sample claims to be Dalit, 9% Adivasi, and 44% OBC. While some of these claims may be aspirational rather than real, this totals a whopping 72%. Among the population aged 25-49, less than 7% have a college degree. By most estimates, less than 3% of the whole population is employed in government and public-sector jobs. Since reservations cover only half the college seats and public-sector jobs, the mismatch is obvious. A vast proporation of the population eligible for reservations must still compete for a tiny number of reserved and non-reserved category jobs. It is not surprising that there is tremendous internal competition within groups.

If we want reservations to make a significant difference in the lives of the marginalized groups, there are only two options. Either the government must drastically increase availability of government jobs and college seats or it must reduce the size of the population eligible for these benefits. While the Supreme Court would not allow reservations to exceed 50%, frankly it does not matter. Whether available public sector jobs cover 1.5% of the population or 3%, these will only offer opportunities to a minuscule fraction of individuals in reserved categories. Hence, the only viable option is to reduce the size of the eligible population, possibly along the lines of sub-categorisation proposed by the government.

However, while the media and claimants to the coveted OBC status such as Jats, Kapus and Patels are busy arguing over the merits of this proposal, very little attention is paid to the practical challenges facing sub-categorisation. How will we know which castes are the most disadvantaged? At the moment, the only reputable nationwide data on caste comes from the 1931 colonial Census and some of the ad hoc surveys conducted for specific castes.

Lack of Credible data

The Socio-Economic Caste Census (SECC) of 2011 was supposed to provide up-to-date comprehensive data. However, the results remain shrouded in mystery. When releasing poverty and deprivation data from the SECC in 2015, it was found that about 4.6 million distinct caste names, including names of gotra, surname and phonetic variations were returned, making the results almost impossible to interpret. For nearly 80 million individuals, caste data were believed to be erroneous. Since then we have heard little about the quality of caste data in SECC and even less about its results. In 2015, the then NITI Aayog Vice Chairperson, Arvind Panagariya, was asked to head a committee to chair the caste classification using SECC data. Little seems to have come of it.

It is not surprising that SECC data have not been able to shed light on socio-economic disadvantages faced by different caste groups: addition of caste information was an ill-conceived graft on what was supposed to be a Below Poverty Line (BPL) survey. This patchwork solution had to be adopted because in spite of wide-spread demands to include caste data in the Census of 2001 and 2011, the Office of the Registrar General was reluctant to add this burden to the decennial exercise. As a way of appeasing the OBC lobby, it was decided that the BPL census would incorporate caste information.

After the probable failure of this effort, it would make sense to rethink collection of caste data in Census. Preparations for Census 2021 are ongoing. There is still time to create an expert group to evaluate the methodology for collecting caste data and include it in the Census forms. Losing this opportunity would leave us hanging for another 10 years without good data for undertaking sub-categorisation of OBC quota or evaluating claims to OBC status by groups like Jats and Patels.

Address caste-based inequalities

A broader issue, however, focuses on whether we want to radically rethink our approach to affirmative action. What would it take to eliminate caste-based disadvantages in next three or four decades? A two pronged approach that focuses on eliminating discrimination and expanding the proportion of population among the disadvantaged groups that benefits from affirmative action policies could be a solution.

The present policies focus on preferential admission to colleges and coveted institutions like IITs and IIMs. But these benefits may come too late in the life of a Kurmi or Gujjar child. Their disadvantage begins in early childhood and grows progressively at higher levels of education. The India Human Development Survey of 2011-12 found that among families where no adult has

completed more than Class X, 59% children from the forward castes are able to read a simple paragraph while the proportion is only 48% for OBCs, 41% for Dalits and 35% for Adivasis. We know little about what goes on in schools to create these disadvantages but improving quality of education for all, including those from marginalized groups, must be a first step in addressing caste-based inequalities.

Activities:

(1) According to the writer, why there is a need for sub-categorization of OBC's

(2) Rewrite the article in your own words.

(3) Discuss the present scenario of reservation policy in India in your group.

3.7 Read the following text.

The Legal status of animals

The monkey selfie case has come to an end, but questions remain unanswered

In 2015, a lawsuit brought by People for the Ethical Treatment of Animals (PETA) claimed that Naruto, an Indonesian crested black macaque, should be entitled to the rights of a self-portrait which the animal had accidentally clicked with the camera of David Slater, a nature photographer. In 2016, a federal court in San Francisco held that while protection under the law may be extended to animals, the same could not be said of copyright laws in which lie vested rights and ownership. PETA's legal team said it would appeal the decision. Fortunately, on September 12, 2017, both the parties decided to settle the matter, with Mr. Slater agreeing to donate 25% of any future revenue from Naruto's images to charities dedicated to the conservation of crested macaques in Indonesia.

This dispute once again gave rise to questions about the legal personality of non-humans.

The 21st century has seen many attempts to recognize animals as legal subjects - from granting them protection from cruel treatment, to arguments for recognizing them as legal persons and granting them property rights - but there has been discomfort in giving them a plenary membership within the human legal community. Scholars like Benjamin Berger have argued that it is the contrived attempt to treat humans and animals similarly that has obscured our understanding of animals as legal subjects, while moral philosopher Peter Singer contends that the idea of the species divide itself is feigned, and so the moral and legal distinction irrelevant.

A legal personality is usually defined as a subject vested with rights and duties. However, within the parameters of law, it has never been confined to human beings and has even included idols and companies. Strangely, though, the same rationale has failed in courts in its application to animals because of the imaginary distinction between the multitude of species, and their inability to carry on legal duties.

Conversations around 'legal personhood' have often been marred by the uncharacteristic merging of 'justice' with 'rights'. The moral and ethical undertones of 'animal justice' are largely absent in the arguments around 'animal rights'. Further, rights can be broken down into formal and substantive rights. The right to appear before the court and plead is different from the right to integrity and equal protection under the law. It is not to say that one has to choose between the two; both are integral to the definition of rights.

The federal court in the Naruto case has merely mirrored the premise that animals can only be objects or properties, but questions regarding the legal standing or legal personality of non-human persons remain unanswered. Ironically, the imperative of granting legal recognition through legal personality reveals both the obscurity and absurdity of extending identities to animals. Even if the courts were to accept limited personhood, we are still left with the reality that the process of recognition is confined to our communities and legal structures. The notion of autonomy and agency of animals will continue to fail. However, the case has pushed us to think over uncharted territories of human/non-human subjectivity in law.

Activities:

(1) What do you know about the monkey's selfie case?

(2) Why animals are recognized as legal subjects.

(3) How in the legal personality in defined.

(4) Briefly explain "animal rights"

3.8 اکائی کے اختتام کی مشقیں:

(1) اردو ادب کی چند مشہور شخصیات پر سوانح حیات کا مطالعہ کیجیے۔

(2) انگریزی ادب کے چند اہم مصنفین کی سوانح حیات کا مطالعہ کیجیے۔

(3) اسکولی مضامین میں سے چند متون کا انتخاب کیجیے اور اس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

(4) اخبارات (اردو اور انگریزی) سے کوئی پانچ مضامین منتخب کیجیے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس پر مباحثہ کیجیے۔

3.9 حوالہ جات:

(1) Sonalde Desai "Re imagining the OBC Quota", The Hindu, September 19, 2017

(2) Sakshi "The Legal Statue of Animals" The Hindu, September 19, 2017

(3) پرویز حفیظ ''اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے ٹرمپ کا خطاب'' روزنامہ اعتماد۔